محمد سلمان ریاض *

علم ترجمہ سے متعلق رجحانات کا اجمالی جائزہ

ترجمے کی تاریخ کو اس سے منسلک نظریاتی رجحانات کے آئینے میں دیکھا جائے تو ہم اسے پانچ بنیادی نظریاتی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں: قبل لسانیاتی [۱] (pre-linguistics)، لسانیاتی (linguistically-based)، بیانی یا توضیحی (descriptive)، تفاعلی (functionalist) اور ثقافتی (cultural)۔ ان مختلف رجحانات کا ارتقا بہت حد تک ایک یک سمتی تدریجی عمل (uni-directional gradual process) ہے جسے ایک مسلسلے (cline) پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اس مسلسلے کے ایک سرے پر مصنف (author) اور ماخذ متن (source text) کی بالا دستی کا پرچار ملتا ہے (یہ وہ روایتی نقطۂ نظر ہے جس کی حیثیت وطنِ عزیز کی علمی دنیا میں آج بھی بے تاج بادشاہ کی سی ہے) تو دوسرے سرے پر 'آزادیِ مترجم' (translator independence) اور 'ہدفی متن کی بالا دستی' (target text dominance) کے نظریات۔[۲] ذیل میں اس رنگا رنگ تاریخ کا مختصر جائزہ دیا جا رہا ہے۔

۱۔ قبل لسانیاتی (pre-linguistics):

آغاز میں اعتقاد یہ تھا کہ ترجمے کو اصل یا ماخذ متن کی کاربن کاپی — یعنی لفظی ترجمہ (literal translation) — ہونا چاہیے۔ مترجمین کے لیے لازم تھا کہ ماخذ متن کے الفاظ کو بعینہٖ ہدفی متن [۳] میں ترجمہ کریں، کچھ اس طرح کہ ترجمہ ماخذ متن کے لیے شفاف آئینے کا کام دے۔ اس کا

فطری نتیجہ یہ نکلا کہ ترجمہ کار کی حیثیت ماخذ متن کے غلام کی سی ہو گئی (آج کل کی زبان میں ہم اس مترجم کو 'میکانکی مترجم' کہہ سکتے ہیں، جس کا کام بس یہ تھا کہ کسی تحریر کی پہلی سطر کے الفاظ کا ترجمہ کرنے سے آغاز کیا اور اسی ڈگر کو برقرار رکھتے ہوئے آخری سطر تک لفظی ترجمہ کرتے چلے گئے)۔ ماخذ متن ایک ایسے مقدس صحیفے کی مانند تھا جس کے الفاظ سے رتی بھر انحراف کا نتیجہ مترجم پر اصل سے بے وفائی کے الزام کی صورت میں نکلتا۔ لفظی ترجمے (literal translation) کے اس نظریے کو — جسے ادب کے ترجمے کے ضمن میں دیکھتے ہوئے ادبی دم کشی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا — سب سے پہلے شاید سسرو[۴] (Cicero) (۱۰۶–۴۳ ق م) نے اسے چیلنج کیا۔اس نے ایٹِک مقررین[۵] (attic orators) کی تقاریر کا ترجمہ کرتے ہوئے آزاد ترجمے (free translation) کا استعمال کیا،[۶] یعنی الفاظ کا ہو بہو ترجمہ کرنے کی بجائے ماخذ متن کے معنی کو سمجھ کر ہدفی زبان (target language) میں ترجمہ کیا۔ لفظی اور معنوی ترجمے کی یہ بحث بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے تک جاری رہی۔

۲۔ لسانیاتی (linguistically-based):

بابائے جدید لسانیات[۷] (father of modern linguistics) فرڈیننڈ ڈی ساسیور (Ferdinand de Saussure) (۱۸۵۷ء–۱۹۱۳ء) کی ۱۹۱۶ء میں چھپنے والی کتاب *Course in General Linguistics*[۸] نے لسانیات کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ زبان پر کی جانے والی تحقیق کو سائنسی رنگ ملا، اور یکے بعد دیگرے ہیئتی (formalist)، ساختی (structuralist) اور پس ساختی (post-structuralist) سائنسی تحقیقی رجحانات سامنے آئے۔اس لسانیاتی انقلاب نے دیگر علوم کے ساتھ ساتھ ترجمے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں ترجمے کا مطالعہ روایتی اقدار کی روشنی میں کیے جانے کی بجائے سائنسی انداز میں ہونے لگا، جس میں بنیادی کام ماخذ متن اور ہدفی متن یا متون کا تقابلی جائزہ (comparative analysis) تھا۔ اس جائزے میں مساوات (equivalence) اور قابلِ ترجمہ ہونے کی اہلیت (translatability) بنیادی سوالات تھے۔ اول الذکر سے مراد یہ تھی کہ آیا ہدفی متن کے الفاظ ماخذ متن کے الفاظ کا صحیح مصداق (denotative) ترجمہ پیش کرتے ہیں یا نہیں۔ اصول یہ تھا کہ ہدفی متن کے الفاظ کو معنی کے اعتبار

سے ماخذ متن کے الفاظ کے انتہائی مماثل ہونا چاہیے۔یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مساوات جامد (static) تصور نہیں، بلکہ گذرتے سالوں کے دوران اس تصور کی مختلف تعریفیں سامنے آتی رہیں، جنھوں نے ماخذ الفاظ / فقرے بمقابلہ ہدفی الفاظ / فقرے کی بجائے مساوات کے تصور میں کشادگی پیدا کرتے ہوئے اس کا سیاق وسباق (جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی) اور معاشرتی وثقافتی عوامل کی روشنی میں مطالعہ کیا۔ابتدائی چند سالوں میں البتہ اسے اسی تنگ نگاہی سے دیکھا گیا جیسا کہ اوپر دی گئی تعریف میں واضح ہے۔مساوات سے مختی ایک تصور، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، کسی لفظ یا فقرے کے ترجمہ کیے جا سکنے کی اہلیت تھا۔اگر ماخذ متن کے کسی لفظ یا فقرے کے مساوی لفظ یا فقرہ ہدفی زبان (target language) میں موجود ہوتا تو یہ لفظ یا فقرہ قابلِ ترجمہ (translatable) کہلاتا اور اگر مفقود ہوتا تو اسے نا قابلِ ترجمہ (untranslatability) کی مثال کے طور پر لیا جاتا تھا۔[9]

آگے بڑھنے سے پہلے اس دور کے ایک اور بنیادی تصور سے واقفیت ضروری ہے۔یہ تصور ترجمے کی اکائی (translation unit) کا ہے۔اس سے مراد متن کا وہ ٹکڑا ہے جسے ترجمے کا جائزہ لینے والا ماخذ متن اور ہدفی متن کے اپنے تقابلی جائزے کی بنیاد بناتا اور یہ جانچنے کی کوشش کرتا ہے کہ آیا ماخذ متن کی یہ تمام اکائیاں ہدفی متن میں ٹھیک سے ترجمہ ہوئی ہیں کہ نہیں۔پہلے پہل لفظ کو ترجمے کی اکائی مانا گیا۔چنانچہ تجزیہ کار ماخذ متن کے الفاظ کا انفرادی طور پر ہدفی متن کے الفاظ سے تقابل کرتا تھا۔بعد میں البتہ ایک کلاز (clause) یا فقرے کی سطح پر تقابل ہونے لگا، یعنی کلاز یا فقرے کو ترجمے کی اکائی مانا گیا۔

اس دور میں ترجمے کے مطالعے کو درج ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

بے سیاق (decontexualized):

ہیئتی اور ساختی تحریکوں نے ساٹھ کے عشرے تک راج کیا۔زبان کے سائنسی مطالعے کے علاوہ ان میں ایک اور قدرِ مشترک زبان کا بے سیاق مطالعہ تھا۔سماجی، ثقافتی اور تاریخی عوامل سے قطع نظر زبان کو ایک جامع بالذات (self-contained) شے سمجھ کر اس کا مطالعہ کیا گیا۔ترجمے پر ہونے والی ابتدائی لسانیاتی تحقیق نے اسی ساختیاتی نظریے کو اپنایا اور ترجمے کے مطالعے میں زبان پر اثر انداز

ہونے والے مذکورہ بالا عوامل کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس سلسلے میں ژاں پال وِنے (Jean Paul Vinay) (۱۹۱۰ء–۱۹۹۹ء)، ژاں ڈار بلنے (Jean Darbelnet) (۱۹۰۴ء–۱۹۹۰ء) اور جان کنِسن کیٹفورڈ (John Cunnison Catford) (۱۹۱۷ء–۲۰۰۹ء) [۱۰] کی تحقیقات اہم ہیں۔

وِنے اور ڈار بلنے کی کتاب ۱۹۵۸ء میں فرانسیسی میں چھپی، اور اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۹۵ء میں سامنے آیا۔ اس کتاب میں مصنفین نے انگریزی اور فرانسیسی متون کا تخالفی تجزیہ (contrastive analysis) پیش کیا اور ترجمے کے عمل میں مستعمل سات حکمتِ عملیوں (strategies) کی نشاندہی کی۔" تجزیے کا جو انداز ان دونوں نے اپنایا وہ تجویزی یا نسخہ جاتی (prescriptive) تھا، جس کے تحت ماخذ متن کے ترجمے میں خامیوں کی نشاندہی کر کے بہتر ترجمہ پیش کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ تجویزی اندازِ تحقیق دو تین دہائیوں کے بعد اپنی قدر کھو بیٹھا لیکن وِنے اور ڈار بلنے کے تخالفی تجزیے کے طریقۂ تحقیق کی، جس میں ماخذ متن اور اس کے ترجمے کا موازنہ کیا جاتا تھا، پیروی ابھی بھی ترجمے کے کئی تحقیقی مطالعوں میں کی جاتی ہے۔

کیٹفورڈ کی تحقیق میں سب سے اہم 'انتقالِ ترجمہ' (translation shift) کا تصور ہے۔ اس کے مطابق ماخذ متن کی کئی ساختی خصوصیات ترجمے کے عمل کے دوران ہدفی متن کی مختلف ساختی خصوصیات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کیٹفورڈ نے ماخذین اور ان کے تراجم پر تحقیق کرتے ہوئے ترجمے کے عمل میں ہونے والے مختلف اقسام کے انتقالات کی نشاندہی کی جن میں چند ایک ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

۱۔ ماخذ کے بڑے فقرات کی ترجمے میں چھوٹے فقرات میں منتقلی

۲۔ ماخذ کے چھوٹے فقرات کی ترجمے میں بڑے فقرات میں منتقلی

۳۔ ایک قواعدی جزوِ کلام (part of speech) کی کسی دوسرے قواعدی جزوِ کلام میں منتقلی، جیسے اسم کی فعل میں یا اسمِ صفت کی اسم میں وغیرہ۔

اگرچہ کیٹفورڈ کی تحقیق بے سیاقی ہونے کے سبب اب اتنی مشہور نہیں، لیکن اس کا دیا ہوا انتقالات کا تصور بعد میں ترویج پانے والے، اور آج کے شاید سب سے مشہور، توضیحی (descriptive)

نظریاتی رجحان کی اساس قرار پایا۔

سیاقی (contexualized):

اس دور کے چند دیگر مشہور محققین نے بے سیاقی ترجمے کے ساتھ ساتھ سیاقی ترجمے کی اہمیت کو بھی پہچانا اور اجاگر کیا۔ان میں یوجین نیڈا (Eugene Nida) (۱۹۱۴ء–۲۰۱۱ء)[۱۲] اور پیٹر نیو مارک (Peter Newmark) (۱۹۱۶ء–۲۰۱۱ء)[۱۳] کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نیڈا بائبل کے ترجمے کا معروف محقق تھا۔لسانیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اس نے امریکن بائبل سوسائٹی (American Bible Society) میں ملازمت اختیار کر لی، اور اگلے کئی سال یہاں بائبل کی ترویج میں کوشاں رہا۔اس کا بڑا کارنامہ بائبل کے تراجم پر سائنسی انداز سے تحقیق کا آغاز تھا۔اس نے سابقہ روایات سے ہٹ کر نوم چومسکی[۱۴] (Noam Chomsky) کے سطحی ترکیب (surface structure) اور عمیق یا اندرونی ترکیب (deep structure)[۱۵] کے تصورات کے ذریعے ترجمے کے عمل کی وضاحت کی۔اس نظریے کے مطابق، ترجمے کے عمل میں تین بنیادی مراحل پیش آتے ہیں:[۱۶]

۱۔ تجزیہ (analysis): ماخذ متن کی سطحی ترکیب کا تجزیہ اس کی ساختی بُنت اور الفاظ کے مطالب کے حوالے سے کیا جاتا ہے (آسان الفاظ میں یوں سمجھ لیجیے کہ مترجم سب سے پہلے ماخذ متن کے الفاظ کے مابین ساختی تعلق اور الفاظ کے مطالب کو اپنے ذہن میں سمجھتا ہے، یعنی ماخذ متن کے فقروں کی سطحی ترکیب کو متعلقہ عمیق ترکیب میں منتقل کر دیتا ہے)۔

۲۔ منتقلی (transfer): یہ عمیق ترکیب مترجم کے دماغ میں ہی ہدفی متن کی عمیق ترکیب میں تبدیل ہوتی ہے۔

۳۔ دوبارہ ترتیب سازی (restructuring): تیسرے اور آخری مرحلے میں ہدفی متن کی عمیق ترکیب صفحۂ قرطاس پر ہدفی متن کی سطحی ترکیب کے پیکر میں سامنے آتی ہے۔

اس کے علاوہ نیڈا نے ایک اور اہم ساختی نظریے، جزیاتی تحلیل (componential analysis)، کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا۔اس کا مقصد ماخذ متن کے کسی لفظ کے قطعی معنی (exact

meaning) کو سمجھنا تھا۔ طریقہ کچھ یوں تھا کہ نیڈا ماخذ متن کے کسی لفظ کی خصوصیات کا ماخذ زبان میں موجود اس سے ملتے جلتے الفاظ کی خصوصیات کے ساتھ تقابل کرتا اور دیکھتا کہ کون سی خصوصیات ملتی جلتی اور کون سی مختلف ہیں۔ اس عمل سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی کہ زیرِ بحث لفظ کس قطعی معنی میں ماخذ متن میں استعمال ہوا ہے،[۱۷] اور اس کی بنیاد پر یہ پرکھا جاتا کہ آیا ہدفی متن میں کیا جانے والا اس لفظ کا ترجمہ اس قطعی مطلب کو کما حقہ ادا کرتا ہے یا نہیں۔ جزیاتی تحلیل کے عمل کو ایک سادہ مثال سے کچھ یوں سمجھا جا سکتا ہے:

نام	جانور	چوپایہ	گوشت خور	پالتو	درندہ	سرخ رنگ	پیلا رنگ	دھاری دار
شیر	X	X	X		X	X		
بلی	X	X	X	X				
چیتا	X	X	X		X		X	X
تیندوا	X	X	X		X		X	

(جدول نمبر ۱: جزیاتی تحلیل)

اس مثال میں چار چوپایوں کی خصوصیات کا تقابل پیش کیا گیا ہے جو ان چاروں میں مشترکات اور تفرقات کو اجاگر کرتا ہے۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب جانور ہیں، چوپائے ہیں اور ساتھ میں گوشت خور ہیں۔ البتہ ان میں سے صرف ایک کو پالتو جانور کے طور پر رکھا جاتا ہے، اور یہ کہ ان میں سے ایک کا رنگ عموماً سرخ ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

یاد رہے کہ یہ مثال صرف ایک عام فہم طریقے سے جزیاتی تحلیل کے عمل سے قاری کی ابتدائی واقفیت کے لیے دی گئی ہے، اور یہ قطعاً نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی بھی اعتبار سے ترجمے کی معنوی پیچیدگیوں کی قطعی عکاس ہے۔ ترجمے کے عمل میں ظاہر ہے مترجم کو کہیں زیادہ مشکل الفاظ کا سامنا ہوتا ہے، جو بظاہر معنوی لحاظ سے مماثل ہوتے ہیں لیکن ان میں بعدِ مشرقین ہوتا ہے، اسی حساب سے ان کی جزیاتی تحلیل کا عمل بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔

ترجمہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں نیڈا نے دو طریقے بیان کیے:

۱۔ ہیئتی مساوات (formal equivalence or correspondence):

ہیئتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ ترجمہ ماخذ متن کی ہیئتی اور معنوی ساخت (formal and semantic structure) کے ممکنہ حد تک قریب ہو۔ یہ کافی حد تک لفظی ترجمے (literal translation) کے روایتی تصور سے ملتا جلتا ہے۔ فرق البتہ یہ ہے کہ نیڈا اس قسم کے ترجمے میں قوسین یا فٹ نوٹس میں ایسے الفاظ و واقعات کی تشریح پر زور دیتا ہے جو ماخذ کی زبان اور ثقافت سے مخصوص ہوں اور بغیر وضاحت کے ان کا سمجھنا ہدفی قارئین کے لیے ممکن نہ ہو۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ ترجمہ سیاقی حقائق کو مدِ نظر نہیں رکھتا، لیکن جو دوسرا نظریہ نیڈا نے پیش کیا اس میں اس نے سیاق کی اہمیت پر خاص زور دیا۔

۲۔ حرکی مساوات (dynamic equivalence):

نیڈا نے ترجمے کی اس قسم کو پیش کرتے ہوئے چند ایسے خیالات کا اظہار کیا جو بعد کے سالوں میں سامنے آنے والے ترجمے کے کچھ اہم نظریات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، جن میں 'نظریہ تفاعل' (functionalist theory) اور 'قاری کا ردِ عمل' (reader-response theory) اہم ہیں۔ اس نظریے میں نیڈا نے الفاظ و معنی کے ترجمے کی بحث سے ہٹ کر یہ تصور دیا کہ ہدفی متن ایسا ہونا چاہیے کہ یہ ہدفی قارئین (target readers) کے اذہان پر وہی تاثر (effect) قائم کرے جو ماخذ متن، ماخذ قارئین (source readers) پر کرتا ہے۔ اس بنیادی نکتے کی تشریح میں اس نے جو اہم نکات بیان کیے ان کا خلاصہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

۱۔ اس وقت تک سامنے آنے والی تحقیقات اور نظریات میں ماخذ متن کی بالادستی کو من و عن تسلیم کیا جاتا تھا، اور ترجمے کی اہمیت محض اصل کی نقل کی سی تھی۔ اسی طرح ماخذ کے الفاظ و معنی میں کسی قسم کی تبدیلی گناہِ عظیم شمار ہوتی تھی۔ نیڈا نے اس حقیقت کے ادراک پر زور دیا کہ بعض اوقات ماخذ متن کے الفاظ، بلکہ معنی، کو من و عن ترجمے کی زبان میں ڈھال دینے سے ہدفی قارئین کے اذہان بات کو ویسے نہیں سمجھ پاتے جیسے کہ ماخذ قارئین، ماخذ متن کو پڑھ کر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ماخذ جیسی اثر پذیری ہدفی متن میں لانے کے لیے بعض اوقات ماخذ متن کی ہیئتی اور لفظی ترتیب میں تبدیلی لازم ہو جاتی

ہے۔اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ماخذ متن کے ساتھ ساتھ ہدفی متن کی اہمیت بھی واضح ہوئی، اور یہ بات سامنے آئی کہ ہدفی متن، ماخذ متن کی محض اندھی تقلید نہیں، بلکہ اس کی اپنی ایک مسلم حیثیت ہے۔

۲۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نیڈا کے پیشِ نظر یہ ان مٹ حقیقت تھی کہ ماخذ اور ترجمے کے اصولِ زباں (linguistic rule) اور ثقافتی اقدار (cultural norms) میں فرق ہوتا ہے (اگر دونوں زبانیں، زبانوں کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں یا کسی اور وجہ سے ایک دوسرے کے قریب ہوں تو یہ فرق کم ہوتا ہے، بصورتِ دیگر یہ فرق بعد المشرقین جتنا بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ عربی اور انگریزی کا فرق)۔اس فرق کے سبب ماخذ متن اور ہدفی متن تب تک ایک جیسی اثر پذیری ظاہر نہیں کر سکتے جب تک ماخذ کو ہدف کے لسانی اور ثقافتی اصولوں کے مطابق ڈھال نہ لیا جائے۔

۳۔ اس قسم کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ خیال رکھا جائے کہ ترجمہ ہدفی زبان کے قارئین کو اتنا فطری لگے کہ انھیں یوں محسوس ہو جیسے وہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ ان کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی ایک اصل (original) تحریر پڑھ رہے ہیں۔یعنی انھیں ترجمے میں قدرتی پن، برجستگی اور اپنائیت محسوس ہو۔

درج ذیل جدول اس ساری بحث کو مختصر اور سادہ الفاظ میں سمیٹتا ہے کہ نیڈا نے اس نظریے میں پرانی ڈگر سے ہٹ کر کیا نکات پیش کیے ہیں:

پرانا نظریہ	حرکی مساوات کا نظریہ
ہدفی متن، ماخذ متن کی محض نقل ہے۔	ہدفی متن کی اپنی اہمیت اور حیثیت ہے۔
ترجمہ کرتے ہوئے صرف لفظی اور معنوی ترکیب کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔	ترجمے کے عمل میں یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ ہدفی متن اپنے قاری کے ذہن پر وہی اثر کیسے چھوڑے جو ماخذ متن اپنے قاری کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔
ترجمہ کرتے ہوئے ماخذ ثقافت اور ہدفی ثقافت کے فرق پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔	ترجمے کے لیے دونوں متون سے منسوب لسانی اور ثقافتی حقائق سے آگاہی اور ان کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔

ترجمہ پڑھتے ہوئے قاری کو صاف پتہ چلے کہ جو تحریر وہ پڑھ رہا ہے وہ اصل میں کسی اور زبان میں لکھی گئی تھی، اور یہ کہ یہ اس کا محض ترجمہ ہے۔	ترجمہ پڑھتے ہوئے قاری کو اتنا قدرتی پن محسوس ہو کہ جیسے یہ تحریر اس کی اپنی زبان (یعنی ہدفی زبان) میں پہلی دفعہ لکھی گئی ہے، اور یہ کسی اور زبان میں لکھی گئی تحریر کا ترجمہ نہیں۔

(جدول نمبر۲: پرانے خیالات اور حرکی مساوات کے نظریے کی خصوصیات کا تقابلی جائزہ)

اس دور کی ایک اور قد آور شخصیت پیٹر نیو مارک ہے۔ نیو مارک نے معنوی ترجمے (semantic translation) اور ابلاغی ترجمے (communicative translation) کے تصورات پیش کیے۔ اگرچہ اس نے ان تصورات کا اظہار نیڈا کے ہیئتی اور حرکی مساوات کے نظریات کی نفی میں کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں محققین کے خیالات آپس میں گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ آیئے ان کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

معنوی ترجمے کا تصور ہیئتی مساوات کے نظریے کی مانند ماخذ متن کو فوقیت دیتے ہوئے اس کی معنوی ترکیب (semantic structure) کو ہدفی متن میں منتقل کرنے کا نکتہ پیش کرتا ہے۔ اسی طرح، ابلاغی ترجمہ حرکی مساوات کے نظریے کی طرح ماخذ متن کے ایسے ترجمے پر زور دیتا ہے جو ہدفی زبان کے پیرائے میں ہو، ہدفی قارئین کو فطری لگے اور اسے پڑھنے، سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ البتہ ان دونوں نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نیو مارک، نیڈا کے 'مساوی اثر پذیری' (equal effect) کے تصور کا انکاری ہے۔ نیو مارک کے مطابق ماخذ اور ہدفی زبانوں اور ثقافتوں میں اتنا بُعد ہوتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہدفی متن اپنے قارئین پر عین وہی اثر چھوڑے جو ماخذ متن اپنے قارئین پر چھوڑتا ہے۔ چنانچہ اثر پذیری کے بالکل ایک سا ہونے کی بجائے یہ تصور دیتا ہے کہ مترجم ماخذ متن کے اثر کو اس حد تک ہدفی متن میں ڈھالے جتنا ممکن ہو۔ یعنی مترجم کو اثر پذیری کے بالکل ایک سا ہونے کی مثالیت پسندی (idealism) سے نکل کر یہ کوشش کرنے چاہیے کہ حقیقت میں ماخذ متن اور ہدفی متن میں جس قدر اثر کی مماثلت (correspondence of effect) وہ قائم کرسکتا ہو کرے۔

دونوں حضرات کے نظریات میں ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں نیڈا، ہیئتی اور حرکی دونوں اقسام کو ہر صنف کے ترجمے کے لیے موزوں گردانتا ہے وہیں نیو مارک معنوی ترجمے کو کچھ اصناف

منسوب کرتا ہے اور ابلاغی ترجمے کو دیگر اصناف کے لیے موزوں قرار دیتا ہے۔ چنانچہ معنوی ترجمہ سنجیدہ ادب، خود نوشت اور کسی اہم سیاسی یا دیگر بیان کے ترجمے کے لیے موزوں ہے، جب کہ معلوماتی متون، غیر ادبی متون اور تشہیر وغیرہ کے لیے ابلاغی ترجمہ موزوں ہے۔

۳۔ توضیحی (descriptive):

ستر اور اسی کی دہائیوں نے ترجمے کے نظریات میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں دیکھیں۔ جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے ظاہر ہے لسانیاتی تحقیق کے دور میں ترجمے کی تحقیق میں تین رجحانات اہم تھے:

۱۔ ترجمے کا مطالعہ تجویزی نقطۂ نظر سے کیا جاتا تھا، یعنی تجزیہ کار ماخذ متن اور ہدفی متن کا بغور تقابلی جائزہ لیتا، یہ نشاندہی کرتا کہ ترجمے میں کیا اغلاط ہیں اور ان کے مقابلے میں درست ترجمہ پیش کرتا۔

۲۔ ترجمے پر اثر انداز ہونے والے تاریخی، سماجی، نفسیاتی اور دیگر بیرونی عوامل سے صرفِ نظر کیا جاتا تھا۔

۳۔ ترجمے کی اکائی لفظ، فریز (phrase)، کلاز (clause) یا زیادہ سے زیادہ ایک فقرہ تھی، یعنی ماخذ متن کے لفظ، فریز، کلاز یا فقرے کا ہدفی متن کے متعلقہ لفظ، فریز، کلاز یا فقرے کے ساتھ موازنہ کیا جاتا تھا۔

ان تصورات کے ردِ عمل میں اٹھنے والی تحریکوں میں ایک بنیادی تحریک توضیحیت (descriptivism) کی تھی۔ اس تحریک کے ترجمانوں نے تجویزیت (prescriptivism) کی بجائے توضیحی نقطۂ نظر کو اپنایا، جس کے تحت ترجمے کے ان پہلوؤں کی نشاندہی تو کی جاتی جو اصل متن سے مختلف تھے لیکن انھیں اغلاط کہہ کر رد کرنے کی بجائے تجزیہ کار یہ کھوج لگاتا کہ کون سے ایسے بیرونی عوامل (external factors) ہیں جو اس فرق کا باعث بنے۔ بالفاظ دیگر، اس قسم کی تحقیق میں عموماً کسی بھی ترجمے کو رد نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اس پر اور ترجمہ کار پر اثر انداز ہونے والے ایسے سماجی، نفسیاتی وغیرہ دباؤ کی نشاندہی کی کوشش کی جاتی جو اس تبدیلی کے لیے محرک ثابت ہوئے۔[۱۸] ذیل میں ایسے چند ایک عوامل کی نشاندہی کی جا رہی ہے:

نمبر شمار	زمرہ (category)	عوامل کی مثالیں
1	سماجی حالات	رسم و رواج، ثقافتی اقدار، سیاسی حالات، صنعتِ نشر و اشاعت کے مروجہ اصول وضروریات اور ناشر یا ترجمہ کروانے والے کسی دیگر ایجنٹ کے مطالبات۔
2	تاریخی پس منظر	اس کے تحت ادبی عوامل اور نفسیاتی عوامل کو لیا جا سکتا ہے، جن کی مثالیں ذیل میں دی گئی ہیں۔
2.1	ادبی عوامل	ماضی اور عصرِ حاضر کی بنیادی ادبی تحریکیں (ہر لکھاری کسی نہ کسی ادبی تحریک سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور اس کا عکس اس کی تحریروں میں نظر آتا ہے)۔
2.2	نفسیاتی عوامل	مصنف اور مترجم کے حالاتِ زندگی (اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لکھاری کی زندگی میں ایسے کون سے حالات پیش آئے جنھوں نے اس کے خیالات اور اعتقادات کو تشکیل دیا، جن کا اثر اس کی تحریروں میں جھلکتا ہے)۔

(جدول نمبر ۳: انتقال (shift) کا باعث بننے والے غیر لسانی (extra-linguistic) عوامل)

تیسرے نکتے، یعنی ترجمے کی اکائی، سے متعلق یہ تبدیلی آئی کہ ترجمے کی تحقیق میں معنی کا مطالعہ فقرے کی سطح سے بڑھ کر کیا جانے لگا۔ نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی لسانیات کے میدان میں متعارف ہونے والے دو بنیادی نظریات کے زیرِ اثر آئی۔ ان نظریات کو متنی لسانیات (text linguistics) اور تجزیہ ڈسکورس (discourse analysis) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چند ایک اختلافات کے استثنا کے ساتھ یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد متن کا ایک ابلاغی اکائی کے طور پر مطالعہ کرنا ہے، یعنی صرف یہ دیکھنے کی بجائے کہ متن کے مختلف حصے (لفظ، فقرے وغیرہ) کیا معنی پیش کرتے ہیں متن کے مجموعی مطالب پر توجہ مبذول کی جائے۔ یہ تجزیۂ ڈسکورس کے نظریے کا ہی اثر تھا جس کے باعث مصنف اور مترجم پر اثر انداز ہونے والے مذکورہ بالا سماجی اور نفسیاتی عوامل ترجمے کی تحقیق کا حصہ بنے۔

اس (توضیحی) انقلاب آفریں تحریک نے جلد ہی ترجمے کی دنیا بھر میں ہونے والی تحقیق میں انتہائی مقبولیت حاصل کر لی، یہاں تک کہ مغربی دنیا، خصوصاً برطانیہ اور آسٹریلیا، میں آج بھی اسی کا

راج ہے، اور سب سے زیادہ کام بھی اسی کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ یہ نظریہ پاکستان میں ابھی ٹھیک طرح سے متعارف نہیں ہوا، اور ترجمے پر جو چند ایک تحقیقات ہمیں نظر آتی ہیں وہ آج بھی تجویزی نقطۂ نظر سے آگے نہیں بڑھ پائیں۔ راقم کا ماننا ہے کہ تجویزیت کی اپنی جگہ اہمیت مسلم ہے اور اس پر تحقیق ختم نہیں ہونی چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہیے کہ توضیحیت کو بھی وطنِ عزیز میں تحقیق کا حصہ بنایا جائے تا کہ اس کے ثمرات بھی سمیٹے جائیں اور عصرِ حاضر میں ترجمے پر ہونے والی تحقیق سے کما حقہ واقفیت حاصل کی جائے۔

اس تحریک میں درج ذیل نظریات کلیدی اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ کثیر نظامی نظریہ (polysystem theory):

روسی ہیئتی اسکالرز (Russian Formalists) — جن میں یوری تنیانوف (Jurij Tynjanov) رومن جیکبسن (Roman Jakobson) اور بورس آئخنبام[19] (Boris Ejkhenbaum) شامل ہیں — کے کام سے متاثر ہو کر مشہور اسرائیلی محقق اتمار ایون زوہار (Itamar Even-Zohar) (۱۹۳۹ء) نے ستر کی دہائی میں یہ نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کی بنیاد روسی ہیئتیت کے 'نظام' کا تصور بنا، جس کے مطابق نظام ایسے اجزا سے بنا ایک تہہ دار ڈھانچہ ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے مربوط اور باہم متعامل ہوتے ہیں۔[20] آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظام مختلف اجزا کے باہم ملاپ سے تشکیل پائی اکائی ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے جڑے اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں، کچھ اس طرح سے کہ اگر نظام کا ایک جز بھی نکال دیا جائے تو نظام کی کاملیت برقرار نہیں رہتی۔ اس کی ایک آسان فہم مثال ایک فقرے کی ہے۔ فقرہ مختلف اجزا (قواعدی اجزائے کلام، یعنی parts of speech) سے ترتیب پایا نظام ہے جس میں تمام اجزائے کلام ایک دوسرے سے متصل اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔ فقرہ تب ہی مکمل معنی ادا کرنے کے قابل ہو گا جب تمام اجزا ایک مخصوص ترتیب (order) میں ہوں گے اور (گرامر کے) مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت ایک اکائی بنائیں گے۔ درج ذیل مثال دیکھیے:

"اردو ہماری زبان ہے۔"

اس میں سے کسی بھی لفظ کو نکالنے سے نظام اپنا پورا معنی ادا کرنے کے قابل نہیں ہو گا۔ مثلاً ہم 'ہماری' کے لفظ کو نکالیں تو بظاہر تو فقرہ معنی خیز نظر آئے گا لیکن یہ بظاہر بے ضرر سا اخراج اس ضمیر شخصی (personal pronoun) سے منسوب نظریاتی معنی (یعنی اپنی زبان سے نسبت اور پیار) کے خسارے (loss of ideological sense) کا سبب ہو گا۔[۲۱] اسی طرح، فقرے کے کسی بھی دوسرے لفظ کا اخراج اس کی کاملیت کو گھائل کرنے کا باعث ہو گا۔

نظام کے اس مستعار نظریے کا اطلاق ادب پر کر کے ایون زوہار نے ادب کو ایک ایسے نظام کے مانند پیش کیا جو مختلف ادبی اصناف کے مرکب سے ترتیب پاتا ہے (یہ یاد رہے کہ اس نظریے کے مطابق ادب بذاتِ خود اپنے سے بڑے ایک نظام کا جز ہے)۔ یہ تمام اصناف ادبی نظام کے اجزا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی حیثیت میں خود بھی ایک نظام ہیں کیونکہ یہ بذاتِ خود ذیلی اجزا کے ملاپ سے مبنی ہیں۔ شاعری کی ہی مثال لے لیجیے۔ یہ دیگر اصناف کے ساتھ مل کر نظامِ ادب کی تشکیل کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک نظام ہے جو ایسی ذیلی اصناف کے ملاپ سے بنا ہے جیسے نظم اور غزل، جو خود مزید ذیلی اجزا میں بٹے ہوئے ہیں، جیسے نظم کے ذیل میں نثری نظم، ماہیے، رباعی، ہائیکو وغیرہ۔ اسی نظام در نظام کی بنا پر اس نظریے کو کثیر نظامی نظریے کا نام دیا گیا۔

ایون زوہار کا مزید یہ کہنا تھا کہ ادبی نظام میں اصنافِ ادب ایک درجہ بند طریقے سے مرتب ہوتی ہیں، اور اس درجہ بندی کا انحصار کسی خاص وقت میں متعلقہ معاشرے میں ان کو دی گئی اہمیت پر ہوتا ہے۔ جن اصناف کی معاشرے میں اہمیت زیادہ ہوگی وہ نظام کے مرکزی حصے پر براجمان ہوں گی، جب کہ کمتر درجے کی حامل اصناف کو مضافات میں جگہ ملے گی (جیسے ہمارے معاشرے میں افسانہ، شاعری اور ناول کی اہمیت مرکزی ہے جب کہ ترجمہ، بچوں کا ادب وغیرہ کمتر درجے کے حامل سمجھے جاتے ہیں)۔ ایون زوہار کے مطابق یہ تمام اصناف مرکز میں جگہ پانے کے لیے باہمی کشمکش کا شکار رہتی ہیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے درجوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت تھا جب برصغیر پاک و ہند میں شاعری کی حیثیت مرکزی اور نثر کی حیثیت ثانوی تھی۔ وقت گذرا اور انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج (اس کی مختصر تفصیل آگے 'نوآبادیاتی ترجمہ' کے ذیل میں آئے گی) اور سرسید کی علمی و

ادبی کاوشوں کے زیرِ اثر نثر کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اسی طرح اگر ترجمے کی بات کی جائے تو فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی کے باعث ترجمے کا مقام بلند ہوا، لیکن آج وطنِ عزیز پاکستان میں اس کی حیثیت ادبی شودر کی سی ہے۔[۲۲]

جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے ظاہر ہے، کثیر نظامی نظریے نے ایک انقلابی کام یہ کیا کہ ترجمے کی تحقیق کو تجویزی نقطۂ نظر اور درست /غلط ترجمے کی بحث سے نکال کر ایک توضیحی رُخ دیا، جس کے تحت ترجمے کا مطالعہ کسی ترجمے پر صحیح یا غلط ہونے کی مہر ثبت کرنے کی بجائے اس نقطۂ نگاہ سے کیا جانے لگا کہ ترجمے کی حقیقی دنیا میں جو حیثیت ہے اور جو عوامل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کی کھوج لگائی جائے۔ ترجمے کو مثالیت پسندی (idealism) کی دنیا سے نکال کر عملی حقائق (practical realities) کے نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا، یعنی تحقیق کا بنیادی سوال 'کیا ہونا چاہیے؟' (یعنی ترجمہ کیسا ہونا چاہیے) کی بجائے 'کیا ہو رہا ہے؟' (یعنی مترجمین اصل دنیا میں ترجمہ کیسے کر رہے ہیں، کسی معاشرے میں ترجمے کی اہمیت کیا ہے، کون سے عوامل ترجمے پر اثر انداز ہوتے ہیں، ناشروں کی کیا مجبوریاں ہیں، تنقید نگار تراجم کو کیسے دیکھتے ہیں وغیرہ) بن گیا (ایسا قطعاً نہ سمجھا جائے کہ اس دور میں تجویزی تحقیق دم توڑ گئی، لیکن یہ ضرور ہوا کہ نئے منظر نامے میں توضیحی تحقیق کی حیثیت مرکزی ہو گئی اور ترجمے پر ہونے والی زیادہ تر تحقیقات اسی کے زیرِ اثر ہونے لگیں)۔

۲۔ معیاراتِ ترجمہ (translation norms):

ایون زوہار کی کثیر نظامی توضیحی تحقیق نے ترجمے کے کئی محققین کو متاثر کیا، جنھوں نے تجویزی نقطۂ نظر کو خیر باد کہہ کر توضیحی نقطۂ نظر کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا۔ ان میں ایک انتہائی اہم نام گِڈیَن ٹوری (Gideon Toury) (۱۹۴۲ء) کا ہے۔ ٹوری اسرائیل کی جامعہ تل ابیب (Tel Aviv University) میں ایون زوہار کا تحقیقی معاون تھا۔ اگرچہ اس نے اپنے نظریات و خیالات ستر کی دہائی میں پیش کرنا شروع کر دیے تھے، لیکن یہ اس کی ۱۹۹۵ء میں چھپنے والی اپنی مشہور و معروف کتاب، *Descriptive Translation Studies – and Beyond*،[۲۳] ہے جس نے اس کے نظریات کی ترویج میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس میں اس نے ترجمے کی توضیحی تحقیق کے خالصتاً تجربی

(experimental) اور منظم (systematic) ہونے پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایسے غیر لسانیاتی عوامل، جیسے سماجی اقدار کا مطالعہ، کو ترجمے کی توضیحی تحقیق کا اہم جز قرار دیا، اور اس ضمن میں معیاراتِ ترجمہ کا تصور پیش کیا۔[۲۴] اس کہنا تھا کہ ترجمے اور مترجم پر بہت سے سماجی عوامل — اس کی چند ایک مثالیں ادبی حلقوں میں ترجمے کا رائج تصور، روایاتِ ترجمہ، ترجمے کے ناقدین کے متعین کیے ہوئے معیارات، ناشرین کی ضروریات و مجبوریاں ہیں — اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ عوامل ترجمے کے کچھ اقدار و معیارات متعین کرنے کا کام دیتے ہیں، جو ہر معاشرے کے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ ٹوری نے ترجمے سے متعلق معیارات کی تین بنیادی اقسام بھی بیان کیں:

۱۔ ابتدائی معیارات (initial norms):

اس قسم سے مراد یہ ہے کہ آیا مترجم ترجمہ کرنے سے پہلے ماخذ متن، زبان اور ثقافت کے معیارات کی پیروی کا فیصلہ کرتا ہے یا ہدفی متن، زبان اور ثقافت کے۔ اگر وہ پہلی قسم کے معیارات پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے تحت ہونے والے ترجمے کو ہم موزوں ترجمہ (adequate translation)، جب کہ دوسری قسم کے تحت ترجمے کو قابلِ قبول ترجمہ (acceptable translation) کہہ سکتے ہیں۔[۲۵] جیسا کہ ظاہر ہے، موزوں ترجمے میں ماخذ کی لسانی و ثقافتی بو باس ہو گی، جب کہ قابلِ قبول ترجمے میں ہدفی لسانیات و ثقافت کا رنگ نمایاں ہوگا۔

۲۔ تمہیدی معیارات (preliminary norms):

اس قسم میں ایسے معیارات شامل ہیں جن کا تعلق ترجمے سے متعلق پالیسی (translation policy) سے ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ طے کرنا ہے کہ کس ادبی (ناول، ڈراما، شاعری وغیرہ) یا غیر ادبی (کاروباری خطوط، اشتہاری پمفلٹ، ملکی آئین وغیرہ) صنف / قسم سے تعلق رکھنے والی تحریروں کا بیرونی زبان سے مقامی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ ایک اور اہم پہلو براہِ راست اور بالواسطہ ترجمے[۲۶] کے بارے میں برداشت یا عدم برداشت کا مظاہرہ ہے، یعنی یہ کہ کیا کسی معاشرے میں رائج معیارات کے مطابق براہِ راست ترجمے (direct translation) کے ساتھ ساتھ بالواسطہ ترجمہ (indirect translation) بھی قابلِ قبول ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کون کون سی ترجیحی زبانیں ایسی

ہیں جن سے کیے جانے والا بالواسطہ ترجمہ سندِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔[۲۷] آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ براہِ راست ترجمے سے مراد ایسا ترجمہ ہے جو اُس زبان سے کیا جائے جس میں ترجمہ کی جانے والی کتاب اصل میں لکھی گئی تھی۔ دوسری طرف، بالواسطہ ترجمہ وہ ہوگا جس میں ترجمہ اصل زبان کے علاوہ کسی اور زبان سے کیا جائے۔ اس قسم کے ترجمے کی شاید بہترین مثال انگریزی زبان میں ترجمہ شدہ روسی اور فرانسیسی کتب کا اردو ترجمہ تھا جو انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کی پہلی تین، چار دہائیوں میں برصغیر میں کثرت سے کیا گیا۔ اگر یہ تراجم براہِ راست روسی اور فرانسیسی زبانوں سے کیے جاتے تو اس قسم کے ترجمے کو براہِ راست ترجمہ کہا جاتا، لیکن چونکہ یہ بالواسطہ طور پر انگریزی میں ترجمہ شدہ کتب سے کیے گئے اس لیے یہ بالواسطہ تراجم کہلائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ترجمہ شدہ تحریر سے ترجمہ کرنے کا یہ عمل کسی معاشرے میں پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھا جاتا ہو، جب کہ کسی اور جگہ اس میں کوئی قباحت محسوس نہ کی جاتی ہو۔ کسی معاشرے میں رہتے ہوئے مترجم ان تمہیدی معیارات کی عموماً پابندی کرتے ہیں۔

۳۔ **عملیاتی معیارات (operational norms):**

ان معیارات کا تعلق ترجمے کے اصل عمل کے لیے اپنائی جانے والی حکمتِ عملیوں اور ترجیحات سے ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہوسکتا ہے کسی معاشرے و ثقافت میں ترجمے کے دوران اضافہ اور حذف جیسی حکمتِ عملیوں [۲۸] کے معاملے میں صفر برداشت کی پالیسی ہو، اسی طرح ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری جگہ ان کا استعمال معیوب نہ گردانا جاتا ہو (ذیل میں اس کی ایک عملی مثال منٹو کی تحاریر کے انگریزی تراجم کے ضمن میں کی گئی تنقید کے حوالے سے آرہی ہے، جس میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ مترجم کو اضافے اور حذف کی حکمتِ عملیاں اپنانے کی پاداش میں ناقد، جو مقامی معیارات — یعنی ترجمے سے متعلق وہ معیارات جو پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں رائج ہیں — کے زیرِ اثر ترجمے کو پرکھ رہا ہے، کی طرف سے کتنی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے)۔

کسی بھی معاشرے میں رہتے ہوئے مترجم فطری طور پر اس معاشرے میں ترجمے سے منسوب معیارات کی پاسداری کی کوشش کرتا ہے، بصورتِ دیگر اس کا ترجمہ قبولیت اور مقبولیت سے

محروم رہتا ہے۔اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں یہ معیار رائج ہو کہ ترجمے کے دوران مترجم ماخذ کے متن میں کسی قسم کے اضافے یا حذف سے دور رہے تو ہر ایسا ترجمہ جو اس معیار سے انحراف برتے گا مطعون ٹھہرے گا۔منٹو کی تحریروں کے خالد حسن [۲۹] (۱۹۳۴ء–۲۰۰۹ء) کی طرف سے کیے جانے والے تراجم پر محمد اسد الدین نے کڑی تنقید کی ہے۔ذیل کا حوالہ دیکھیے:

> Secondly, the most serious of all Hasan's errors is his omission of large chunks of the original texts in his English translations. He leaves out not only sentences but whole paragraphs, indeed even pages, thereby doing great violence to the original text.
>
> ثانیاً حسن کی سب سے بڑی غلطی انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اصل متن کے بڑے بڑے حصوں کو حذف کرنا ہے۔وہ فقرات کے علاوہ پیراگراف بھی چھوڑ دیتا ہے، حتیٰ کہ صفحات بھی، اور اس طرح اصل متن کا حلیہ بڑی حد تک بگاڑ دیتا ہے۔[۳۰]

یاد رہے کہ یہ صرف ایک ناقد کی ذاتی رائے نہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، پاکستان اور انڈیا کے ادبی حلقوں میں ترجمے کے متعین معیارات میں سے ایک کا اظہار ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ معیاراتِ ترجمہ کا تصور پیش کرتے ہوئے مبینہ طور پر ٹوری کے ذہن میں یہ بات ایک معلوم حقیقت کی طرح راسخ تھی کہ ترجمے سے مراد بیرونی زبان (foreign language) سے اپنی مادری زبان (native language) میں ترجمہ ہے (چنانچہ بیرونی زبان، ماخذ زبان اور مادری زبان، ہدفی زبان کہلائے گی)، اور اسی لیے جب وہ معیارات کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد ہدفی ثقافت و معاشرے کے معیارات ہوتے ہیں، نہ کہ ماخذ ثقافت کے۔اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے محمد اسد الدین کی تنقید کو پھر پڑھیں تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس تنقید میں ہدفی ثقافت (انگریزی ثقافت) کے معیارات کی بجائے ماخذ ثقافت (اردو ثقافت) کے معیارات کے مطابق خالد حسن کے تراجم کا مطالعہ کیا گیا ہے، جو ٹوری کے نظریے کے بنیادی اصول کے بالکل برعکس ہے۔البتہ اس سقم کے باوجود یہاں اس کی مثال صرف اس لیے دی

گئی ہے کہ ایک عام فہم اور اپنے معاشرے سے متعلق مثال سے معیاراتِ ترجمہ کے تصور اور اس کی اہمیت کو واضح کیا جا سکے۔

آخری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ معیارات جامد نہیں ہوتے، بلکہ بدلتے حالات کے ساتھ ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ چنانچہ عجب نہیں کہ جیسے جیسے پاکستانی مترجمین، ناقدین، قارئین اور محققین ترجمے کے جدید نظریات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہوتے جائیں ترجمے سے متعلق آج کے معیارات، جن میں سے ایک کا ذکر خالد حسن کے تراجم کے ضمن میں اوپر آیا ہے، میں اگلے کچھ سالوں میں تبدیلی آ جائے۔

ٹوری کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جن محققین نے معیاراتِ ترجمہ پر کام کیا ان میں چند بڑے نام حسبِ ذیل ہیں: کرسٹینا شیفنر (Christina Schäffner) (۱۹۵۰ء)، اینڈریو چیسٹرمان (Andrew Chesterman) (۱۹۴۶ء)، اور تھیو ہرمنز (Theo Hermans) (۱۹۴۸ء)۔ ان سب کا کام معیارات کے نظریے کو آگے بڑھاتا اور ان میں وسعت لاتا ہے۔[۳۱]

۳۔ ترجمے کی عالمگیر خصوصیات (universals of translation):

چند توضیحی تحقیق کاروں نے اس تحقیق کا آغاز کیا کہ آیا ترجمے کی کوئی ایسی خصوصیت بھی ہے جو ہر ثقافت، ہر معاشرے میں رائج ہو۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اس تحقیق کا رُخ ٹوری کے فلسفے کی بالکل مخالف سمت میں ہے، کیونکہ معیارات، عالمگیر خصوصیات کے برعکس، متعلقہ (relative) ہوتے ہیں، یعنی ثقافت بہ ثقافت تبدیل ہوتے ہیں۔ میلم کیئر (Malmkjær) کے مطابق[۳۲] یہ مونا بیکر (Mona Baker) (۱۹۵۳ء) تھی جس کے ۱۹۹۳ء میں چھپنے والے تحقیقی مقالے[۳۳] نے عالمگیر خصوصیات کے ضمن میں ہونے والی تحقیق کے لیے مہمیز کا کام کیا۔[۳۴] اس مقالے سے متاثر ہو کر بہت سی تحقیقات سامنے آئیں (اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے) جن کا مطمحِ نظر یہ جاننا تھا کہ ترجمے کی کون سی ایسی خصوصیات ہیں جو ہر معاشرے و ثقافت میں یکساں ہوتی ہیں۔ مونا بیکر نے جو ممکنہ عالمگیر خصوصیات پیش کیں ان میں سے چند اہم صراحت (explicitation)، ردِ ابہام (disambiguation)، تسہیل (simplification) اور تکرار سے احتراز (avoidance of repetition) ہیں۔ اگرچہ یہ

اصطلاحات (terms) خود وضاحتی (self-explanatory) ہیں، لیکن اس نکتے کو سمجھانے کی خاطر ان میں سے ایک، یعنی صراحت، کی مختصر وضاحت یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

یہ ایک ایسی حکمتِ عملی ہے جس کے تحت مترجم ماخذ متن کے کچھ حصوں کو اصل کی نسبت زیادہ تفصیل سے بیان کرتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کی خالص لسانیاتی وجوہات ذرا پیچیدہ قسم کی ہیں، اس لیے ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہاں جس وجہ کا ذکر کیا جائے گا وہ ماخذ اور ہدف کے مابین ثقافتی فرق ہے۔ چونکہ ہدفی قارئین عموماً ماخذ ثقافت اور تاریخ وغیرہ سے واقف نہیں ہوتے اس لیے مترجم ان کی آسانی کے لیے ایسے حصوں کو تشریحی انداز میں بیان کرتا ہے جو ماخذ ثقافت کا امتیاز ہوتے ہیں اور اس لیے ان کو سمجھنا قاری کے لیے مشکل ہوسکتا ہے۔ اس کی سادہ اور دلچسپ مثال منٹو کے شہرہ آفاق افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں لفظ 'مرونڈے' کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ چونکہ یہ خالص ہماری ثقافت سے متعلق ہے، اس لیے انگریزی میں اس کا کوئی براہ راست متبادل لفظ نہیں۔ اس وجہ سے منٹو کی مشہور مغربی مترجم پریچٹ[۳۵] (Pritchett) نے اس کا ترجمہ ''puffed-rice candy'' کے طور پر کیا ہے۔ اس کو اگر لفظ بہ لفظ اردو میں ترجمہ کیا جائے تو یہ ''پھولے ہوئے چاولوں کی کینڈی/ مٹھائی'' بنے گا۔ جیسا کہ اس مثال سے واضح ہے، مترجم نے ہدفی قاری (یعنی انگریز قاری) کو برصغیر کی ثقافت سے مخصوص اس لفظ کو سمجھانے کے لیے صراحت کی حکمتِ عملی (strategy) سے کام لیا ہے۔

۴۔ عمل سمتی رجحان (process-oriented approach):

توضیحیت کے ذیل میں ابھی تک ہم نے جو نظریات بیان کیے ہیں ان سب میں ایک تحقیقی رجحان مشترک دکھائی دیتا ہے، جسے مصنوعہ سمتی رجحان (product-oriented approach) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان تمام نظریات میں ترجمے کو ایک مصنوعہ یا پیداوار (product) کے طور پر لیا جاتا ہے، لیکن اس مصنوعہ کے بننے کے عمل کا مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ اس ثقیل فلسفے کو ایسے سمجھا جا سکتا ہے کہ مصنوعہ سمتی رجحان میں نظریے کا کرداری (behaviouristic) مطالعہ کیا جاتا ہے، جب کہ ثانی الذکر میں ادراکی (cognitive)۔ کرداری مطالعے میں ان بیرونی چیزوں (external items)

پر بحث ہوتی ہے جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، جیسے انتقالات، ترجمے پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور معیاراتِ ترجمہ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہوتا ہے — وہ اپنے ذہن میں تحریر کی ماہیت، معنوی ترتیب، اسلوب، ترجمے کی حکمتِ عملیاں، اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ ترتیب دے رہا ہوتا ہے، اور جو ترجمہ لکھی ہوئی وضع میں ہمارے سامنے آتا ہے وہ اس ساری ذہنی مشقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ اندرونی حقائق (intrinsic realities) جو ترجمے کے عمل میں بروئے کار آتے ہیں ان پر تحقیق کو عمل سمتی تحقیق کہا جا سکتا ہے۔

اس کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے ترجمے کے چند توضیحی محققین نے اس پر توجہ مبذول کی۔ لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کسی کے ذہن میں داخل ہونا اور اس کی سوچوں کا مشاہدہ کرنا آسان نہیں، اس لیے اس سلسلے میں ہونے والی زیادہ تر کوششیں کامیاب نہ ہو پائیں۔ البتہ اسّی کی دہائی کے آخر[۳۶] میں شروع ہونے والے ایک تحقیقی طریقہ کار (research method) کے باعث اس کام میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ طریقہ کار با آوازِ بلند خود کلامی/سوچ پروٹوکول (think-aloud protocol) ہے۔ اس تجربی طریقہ کار (experimental method) میں مترجم، جو اس تجربے میں معمول کا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے، کا کام یہ ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے جو کچھ بھی اس کے ذہن میں آتا ہے اسے اونچی آواز میں بولتا جاتا ہے، بالفاظِ دیگر اپنی سوچوں کو زبان دیتا ہے، اور اس دوران اس ساری خود کلامی کی صوتی (audio) یا بصری (video) ریکارڈنگ ہوتی رہتی ہے۔[۳۷] اس ریکارڈنگ کے بغور مطالعے سے محقق یہ جاننے کی سعی کرتا ہے کہ مترجمین ترجمے کے عمل کے دوران ماخذ متن کی ہیئت اور معنی کو کیسے سمجھتے ہیں، ترجمے کے لیے کیا حکمتِ عملیاں طے کرتے ہیں، ترجمہ کرتے ہوئے پیش آنے والی لسانی اور ثقافتی مشکلات سے کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ تفاعلی (functionalist):

ستر کی دہائی میں لسانیاتی/بے سیاقی تحقیق کے خلاف توضیحیت کے پہلو بہ پہلو ایک اور تحریک جرمنی میں جنم لے رہی تھی، جو آنے والے سالوں میں تفاعلی رجحان (functionalist approach) کہلائی۔ اگرچہ اس رجحان کو نہ صرف جرمنی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ترجمے کے محققین نے اپنایا، لیکن

جب بھی اس کے معماروں کا ذکر آتا ہے تو درج ذیل چار جرمن محققین کے ہی نام سامنے آتے ہیں: کیتھرینا رائس (Katharina Reiss) (۱۹۲۳ء)، جُستا ہولز منٹیری (Justa Holz-Mänttäri) (۱۹۳۶ء)، ہانس ورمیئر (Hans Vermeer) (۱۹۳۰ء–۲۰۱۰ء) اور کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord) (۱۹۴۳ء)۔ اس رجحان کا اساسی نظریہ (base theory) ہانس ورمیئر کا نظریۂ مقصدیت (purpose-based theory) ہے۔ البتہ اس رجحان کے ارتقا کو ایک تسلسل میں دیکھنے کے لیے ورمیئر کے کام سے پہلے رائس اور ہولز منٹیری، اور بعد میں نارڈ کی تحقیق کا ذکر ضروری ہے۔ آیئے ان محققین کے کام کو ترتیب میں دیکھتے ہیں، جس سے اس رجحان کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجائے گی۔

۱۔ کیتھرینا رائس[۳۸] (Katharina Reiss):

رائس کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ترجمے کے عمل میں متنی صنفیات (text typology) کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس نے جرمنی کے مشہور ماہرِ لسانیات (linguist) کارل بوہلر[۳۹] (Karl Bühler) (۱۸۷۹ء–۱۹۶۳ء) کے تجویز کردہ لسانی افعال (functions of language) کی تقلید کرتے ہوئے متون کو تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا:

معلوماتی (informational)– متن کی وہ قسم جس کا مقصد معلومات، حقائق وغیرہ کی فراہمی ہے، جیسے درسی کتب (text books)، دفتری رپورٹس، عدالتی حکم نامے، اخباری خبریں اور کالمز، سائنسی رسائل، مضامین، تحقیقی مقالہ جات وغیرہ۔

اظہاریہ (expressive)– متن کی ایسی قسم جس کا مقصد ذاتی خیالات کا اظہار ہے، جیسے ناول، افسانے، شاعری وغیرہ۔

عملیاتی (operative)– متن کی وہ قسم جو قاری کو کسی عمل پر اکساتی ہے، جیسے اشتہارات، تقاریر وغیرہ۔

رائس نے البتہ یہ اعتراف بھی کیا کہ کوئی متن مکمل طور پر ایک ہی متنی قسم کا عکاس نہیں ہوتا، بلکہ ایک سے زیادہ اقسام کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ کوئی ایک قسم غالب ہوتی ہے اور ہر

متن کی شناخت یہ غالب قسم ہوتی ہے۔

اوپر بیان کردہ ہر متنی قسم کی اپنی اپنی خصوصیات وضروریات ہوتی ہیں اور اسی لیے ترجمہ کرنے کے لیے ہر ایک کے لیے مختلف حکمتِ عملیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رائس نے زور دیا کہ کسی متن کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم اس کی قسم (text type) کی شناخت کرے اور پھر اس کے مطابق ترجمے کی حکمتِ عملیاں (translation strategies) ترتیب دے۔

ترجمے کی تحقیق کے ضمن میں یہ ایک اہم پیش رفت تھی اور اس کا علمی دنیا میں خیر مقدم کیا گیا۔

۲۔ جسٹا ہولز منٹیری[۴۰] (Justa Holz-Mänttäri):

تفاعلی نظریاتی رجحان کی عمارت کھڑی کرنے میں ہولز منٹیری نے جو بنیادی تصورات پیش کیے ان کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

نظریۂ فعل (action theory) سے متاثر ہو کر اس نے ترجمے کو بھی ایک فعل (translational action) کے طور پر پیش کیا۔ یاد رکھیے کہ ہر فعل کے ایک یا زیادہ مقاصد ہوتے ہیں۔ مثلاً اس آرٹیکل کو ہی لے لیجیے۔ اس تحریری فعل کو انجام دینے کا/کے کوئی خاص مقصد/ مقاصد ہیں (اس کے لیے اس آرٹیکل کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے)۔ اسی طرح ترجمہ کرنا بھی ایک فعل ہے، جو کسی خاص مقصد یا مقاصد سے تشکیل پاتا ہے۔ ترجمہ کس قسم کا ہو گا اور اس میں کیا ترجماتی حکمتِ عملیاں اختیار کی جائیں گی اس کا انحصار اس مقصد پر ہوتا ہے جس کے تحت کسی متن کے ترجمے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ساٹھ، ستر کی دہائیوں تک تحقیق کا دائرۂ کار ادبی یا مذہبی تراجم تک محدود تھا۔ رائس نے اس میں کشادگی پیدا کرتے ہوئے ادبی اور غیر ادبی یا ٹیکنیکل دونوں طرح کے تراجم کا ذکر کیا، اور ہولز منٹیری نے اس سے دو ہاتھ آگے نکل کر صرف غیر ادبی یا ٹیکنیکل ترجمے پر توجہ مبذول کی (یہ رجحان ہمیں اگلے کافی سالوں تک تفاعلی محققین کی تحریروں میں نظر آیا، کچھ اس حد تک کہ آج ایسے مفکرین بھی ہیں جو تفاعلی تحقیق کو محض غیر ادبی یا ٹیکنکل ترجمے کے مطالعے کے لیے ٹھیک گردانتے ہیں، یعنی ان کی نظر میں ادبی ترجمے پر تحقیق کے لیے یہ موزوں نظریاتی رجحان نہیں)۔[۴۱]

ہولز منٹیری کا کہنا تھا کہ ترجمے کو محض ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ وفقرات کی منتقلی نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ ایسا عمل ہے جو افراد کے درمیان (اس کی تفصیل اگلے نکتے میں آئے گی) تعامل (interaction) اور تبادلۂ خیال کا کام دیتا ہے۔

اس نے افراد کے درمیان ہونے والے اس تبادلۂ خیال میں درج ذیل چھے کرداروں کی نشاندہی کی:[۴۲]

آغاز کنندہ (the initiator)– وہ شخص یا ادارہ جسے کسی مقصد کے حصول کے لیے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

منتظم (the commissioner)– وہ شخص جو مترجم سے رابطہ کرتا اور اسے ترجمے کا کام سونپتا ہے۔

ماخذ متن پیش کار (source text producer)– وہ شخص جو ماخذ متن کا لکھاری ہوتا ہے۔

ہدفی متن پیش کار (target text producer)– مترجم

ہدفی متن استعمال کنندہ (target text user)– وہ شخص جو ترجمے کو کسی مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے، مثلاً کمپنی کی مصنوعات کو کسی دوسرے ملک میں متعارف کروانے کے لیے۔

ہدفی متن وصول کنندہ (target text receiver)– ہدفی متن کا قاری۔

پچاس، ساٹھ کی دہائیوں کے لسانیاتی نظریات میں ماخذ متن کو ترجمہ شدہ متن پر برتری حاصل تھی اور ترجمے کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ کرنے میں ماخذ متن کی حیثیت ایک حوالہ جاتی نکتے (point of reference) کی تھی، یعنی اگر ترجمہ ماخذ کے اصول وضوابط سے مطابقت رکھتا ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں رکھتا تو غلط ہے۔ ہولز منٹیری نے اس کے مقابلے میں ہدفی ثقافت اور ہدفی قارئین کو اہمیت دی۔ اس کا کہنا تھا کہ ترجمہ ایسا ہو جو ہدفی ثقافت کے اصول وضوابط اور روایات سے میل کھاتا ہو اور جو قارئین کی ضروریات سے مطابقت رکھتا ہو (یعنی آسانی سے سمجھ آنے والا ہو اور ہدفی قاری اسے پڑھتے ہوئے اپنی زبان اور ثقافت کی چاشنی محسوس کرے، نہ کہ ماخذ زبان وثقافت کی)۔

اس سے پہلے مترجم بیچارے کو ثانوی سی حیثیت دی جاتی تھی، جس کا کام بس ایک متن کے الفاظ کو دوسرے متن کے الفاظ میں منتقل کر دینا تھا۔ ہولز منٹیری، جو کہ خود بھی پروفیشنل مترجم تھی، نے

ترجمے کے ضمن میں مترجم کی مرکزی حیثیت پر زور دیا۔ اس نے مترجم کو بین الثقافتی ماہر (inter-cultural expert) کا لقب دیا،اور واضح کیا کہ مترجم دو زبانوں اور ثقافتوں کا ماہر ہونے کے باعث سب سے بہتر جانتا ہے کہ ماخذ متن میں موجود ثقافتی حوالوں (cultural references) کو احسن طریقے سے کیسے ہدفی متن میں منتقل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہولز منٹیری کے پیش کیے ہوئے نکات جدید اور اہم نوعیت کے تھے، لیکن وہ ان تمام کو ترجمے کے ایک باقاعدہ نظریے (translation theory) میں نہ ڈھال پائی۔ یہ کام ورمیئر نے کیا۔

۳۔ ہانس ورمیئر[۴۳] (Hans Vermeer):

ورمیئر نے اپنے خیالات کو ایک باقاعدہ تفاعلی نظریے کی شکل دی جسے سکوپوس نظریے (Skopos Theory) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یونانی زبان سے مشتق اس لفظ کا مطلب 'مقصد' ہے۔سکوپوس نظریے میں بھی ہولز منٹیری کے خیالات کی طرح ترجمے کو ایک ایسے فعل اور ابلاغی عمل کے طور پر لیا جاتا ہے جو کسی خاص مقصد سے تحریک پاتا ہے۔ یہی مقصد طے کرتا ہے کہ ترجمے کے دوران مترجم کیا طریقۂ عمل اختیار کرے گا۔ یہ بات انتہائی اہم اور یاد رکھنے کی ہے کہ ورمیئر کے نظریے میں مقصد سے مراد وہ مقصد نہیں جس کے زیرِ اثر ماخذ متن تشکیل پاتا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ مقصد ہے جس کے باعث ہدفی متن کی تخلیق کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس مقصد کا تعین کیسے ہوتا ہے تو اس سلسلے میں اس نے کمشن (commission) کی اہمیت اجاگر کی۔کمشن سے مراد وہ تحریری ہدایات ہیں جو کلائنٹ، جسے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے، کام مترجم کے سپرد کرتے ہوئے اسے فراہم کرتا ہے۔ ایک مثالی کمشن وہ ہوگا جس میں کلائنٹ انتہائی جامع انداز میں ترجمے کے مقصد/مقاصد پر روشنی ڈالے، تاکہ مترجم کو واضح طور پر معلوم ہو کہ اس نے ہدفی متن کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کے لیے کس طرح ترجمہ کرنا ہے۔فرض کیجیے کہ درکار معلومات کمشن میں کما حقہ بیان نہیں کی گئیں (چونکہ کلائنٹ عموماً ترجمے کا ماہر نہیں ہوتا،اس لیے فطری طور پر وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ اسے کمشن میں کیا کچھ لکھنا چاہیے)۔ایسی صورت میں مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ

کلائنٹ سے رابطہ کرے تاکہ سوال و جواب کے ذریعے یہ تعین کیا جائے کہ کلائنٹ کو کس قسم کا ترجمہ درکار ہے۔ اگر مترجم محسوس کرے کہ کلائنٹ کا مقصد، یا اس کا کوئی حصہ، پایۂ تکمیل تک پہنچنا ممکن نہیں تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اس بارے میں ایمانداری سے کلائنٹ کو بتا دے۔

اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ، جیسا اوپر کی تفصیل میں اشارۃً ذکر ہوا ہے، ورمیئر کے نزدیک بنیادی اہمیت ماخذ متن کی نہیں بلکہ ہدفی متن کی ہے، کیونکہ یہ ہدفی متن ہے جسے کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے خاص انداز میں تشکیل وترتیب دیا جاتا ہے۔ یہ تصور انسانی تاریخ کے پچھلے تمام نظریاتِ ترجمہ کے بالکل متضاد ہے جن میں بنیادی اہمیت ماخذ متن کی ہوتی تھی۔ اس تجدیدی نقطۂ نظر نے یوں سمجھیے کہ مترجم کو مکمل آزادی عطا کر دی، کچھ یوں کہ اب وہ ماخذ متن کے تابع نہیں رہا تھا، بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے 'ماہر ترجمہ' کی تھی جس کا کام بتائے گئے مقصد/مقاصد کے تحت ایک نئے متن کی تخلیق تھا۔ یہ بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ چونکہ اس نظریے میں ہدفی متن کا انحصار ماخذ متن کی بجائے مقصد پر ہے، اس لیے ایک ماخذ متن کے کئی طرح کے تراجم ممکن ہیں، یعنی جتنے مختلف مقاصد، اتنے ہی مختلف تراجم۔ فرض کیجیے کہ اگر دس مختلف کلائنٹس ایک ہی ماخذ متن کو دس مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نتیجہ دس ایسے ہدفی متون کی صورت میں نکلے گا جو ایک دوسرے سے کسی حد تک مختلف ہوں گے۔ اس نظریے نے ماخذ متن کی اہمیت کا دیوالیہ ہی نکال دیا۔ ماخذ متن اب باقاعدہ حوالہ جاتی نکتہ (point of reference) نہیں بلکہ محض معلومات کے حصول کا ایک ذریعہ (source of information) تھا۔ اس کے منطقی نتیجے کے طور پر ایسے ہدفی متون سامنے آ سکتے تھے جو ماخذ متن سے بالکل مختلف ہوتے۔ اعتراض کیے جانے پر مترجم آسانی سے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتا تھا کہ اس نے تو محض کلائنٹ کے بتائے ہوئے مقصد کی پیروی کی تھی۔ یہ ایک ایسا سقم تھا جس کے باعث اس نظریے کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے حل کے لیے ایک اور تفاعلی ماہر (functionalist expert) کرسٹیانا نارڈ نے کافی کام کیا۔

۳۔ کرسٹیانا نارڈ[۴۴] (Christiane Nord):

کرسٹیانا نارڈ ویسے تو سکوپوس نظریے کے زیادہ تر نکات کی حامی اور مقلد تھی مگر اسے ادراک

تھا کہ اس میں چند ایک کمزوریاں بھی ہیں۔ مثلاً وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ اگر کسی دیے گئے مقصد کے علاوہ اور کوئی چیز مترجم کے لیے مقدم نہ ہو تو اس کا نتیجہ بے شمار ہدفی متون کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ راقم اسی ضمن میں اس نفسیاتی پہلو کی طرف بھی قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہے کہ یہ ہدفی متون اصل متن کے مصنف کے لیے ذہنی اذیت اور کوفت کا باعث بھی بن سکتے ہیں، کیونکہ اس کے لیے یہ دیکھنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے کہ اس کی تحریر کو جو چاہے جیسے چاہے توڑ موڑ کر پیش کر دے۔ اسی طرح وہ اسے اپنی اور / یا اپنی تخلیق کی بے حُرمتی بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس سقم کے حل کے طور پر اس نے 'اصولِ وفاداری' (Principle of Loyalty) کا تصور دیا۔ اس اصول کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کلائنٹ کے دیے گئے مقصد / مقاصد کے علاوہ ترجمے سے منسوب تمام اشخاص (اس کے لیے دیکھیے ہولز منٹیری کے بیان کردہ چھے کردار) کی ضروریات کا دھیان رکھنا بھی مترجم کی ذمہ داری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مترجم کلائنٹ کی طرف سے تفویض کردہ کسی بھی ایسے مقصد کی پیروی نہیں کرے گا جو کسی دوسرے 'اسٹیک ہولڈر' (stakeholder) کی توقعات کے لیے ضرر رساں ہو۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ اس پر کلائنٹ سے بات کرے اور کمشن، جسے کرسٹیانا نارڈ نے ہدایت نامہ برائے ترجمہ (translation brief) کا نام دیا، میں ضروری تبدیلیاں کرنے کے لیے قائل کرے۔ اگر کلائنٹ مصر ہو کہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی تو مترجم کام کرنے سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

(کرسٹیانا نارڈ کے پیش کیے گئے دو تین اور نکات بھی اہم ہیں، لیکن وہ نوعیت میں ذرا ٹیکنکل ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے ان کا مفصل بیان ضروری ہے، جس کا احاطہ اس ابتدائی آرٹیکل میں ممکن نہیں۔)

۵۔ ثقافتی (cultural):

اسّی کی دہائی میں ترجمے کے کچھ محققین نے ضرورت محسوس کی کہ ترجمے کو محض لسانیاتی رنگ میں دیکھنے کی بجائے خالصتاً بین الثقافتی روپ میں دیکھا جائے۔ چنانچہ ایسی تحقیقات سامنے آئیں جن میں کسی متن کے لسانی جائزے کی بجائے اس کے ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی کردار، اس کی تاریخ، آئیڈیالوجی، اور صنعتِ ترجمہ کی روایات وغیرہ کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ اسی طرح مترجم کے کردار پر نئے

انداز سے بحث کا آغاز ہوا۔ الغرض اس نقطۂ نظر کی تبدیلی نے تحقیق کے بہت سے نئے در وا کیے اور تحقیق کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا گیا۔ اس دور میں، جسے مشہور محققین آندرے لیفیور (۱۹۴۵ء–۱۹۹۶ء) اور سوسن بیسنٹ (۱۹۴۵ء) نے 'ثقافتی موڑ' (cultural turn) کا نام دیا،[۴۵] ہونے والی بے شمار تحقیقات کا مکمل احاطہ تو ممکن نہیں لیکن ہم درج ذیل چند بنیادی تحقیقی رجحانات کی نشاندہی کر سکتے ہیں:

۱۔ ترجمہ بطور مکرر تحریر (translation as rewriting)، ۲۔ مابعد نو آبادیاتی ترجمہ (postcolonial translation)، ۳۔ ترجمہ اور جنس (translation and gender) اور ۴۔ ترجمے کو اپنا اور پرایا بنانا (domestication and foreignization of translation)۔

۱۔ ترجمہ بطور مکرر تحریر (translation as rewriting):

مشہور محقق لیفیور نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ترجمہ محض

۱۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں مافی الضمیر کی منتقلی نہیں بلکہ ثقافتی تبادلے کا نام ہے۔

۲۔ نقالی نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے جس میں مترجم ہدفی زبان میں نئے سرے سے ایک تحریر تخلیق کرتا ہے۔

اس تخلیقی اور ثقافتی عمل کی کٹھالی میں تیار ہونے والے ترجمے کو اس نے مکرر تحریر[۴۶] (rewriting) یا انعطاف (refraction) کا نام دیا، جس سے مراد ایسا ترجمہ ہے جو ماخذ متن سے ہیئتی، معنوی اور اسلوبی سطحوں پر کسی حد تک مختلف ہو۔ اس نے ان عوامل کا بھی جائزہ لیا جو ترجمے پر اثر انداز ہوتے اور مکرر ترجمے یا انعطافی ترجمے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ عوامل مل کر اصل مصنف اور اس کے اسلوب بیان کا ایک خاص امیج ہدفی معاشرے میں پیدا کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ لیفیور کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد، راقم نے ان عوامل کو درج ذیل پانچ بنیادی زمروں میں تقسیم کیا ہے (یاد رہے کہ لیفیور کے بیان کردہ ان عوامل کا اطلاق ہر ادبی تحریر پر ہوتا ہے، اور یہ محض ترجمے سے منسوب نہیں، لیکن اس آرٹیکل کی نوعیت کے باعث صرف ترجمے کے ضمن میں ان کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے)۔[۴۷]

سرپرستی (patronage):

اس سے مراد وہ افراد یا حکومتی و نجی ادارے ہیں جو ترجمے کی ترویج کے لیے کام کرتے

ہیں۔ بادشاہت کے دور میں عموماً بادشاہ ترجمے اور مترجمین کے لیے مربی کا کردار ادا کرتے تھے، جیسے اسلامی تاریخ میں عباسی بادشاہ جنھوں نے یونانی فلسفہ وحکمت کو عربی میں ترجمہ کرنے کے عمل کی سرپرستی کی اور دارالحکمت کے نام سے تالیف وترجمے کا ایک الگ ادارہ قائم کیا جو کم وبیش دو صدیوں تک کام کرتا رہا۔انھوں نے مترجمین کی خدمات معاوضے پر لیں، اور شاہی سرپرستی میں بے شمار یونانی اور رومی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کروایا۔[۴۸] آج کے دور میں حکومتی وتعلیمی ادارے اور نجی ناشرین ترجمے کی سرپرستی میں مشغول ہیں۔مثلاً پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان نے اس سلسلے میں کام کیا ہے۔

سرپرستی کرنے والے افراد اور اداروں کے اپنے مقاصد (purposes) اور نظریات (ideology) وغیرہ ہوتے ہیں، جو مترجم اور ترجمے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی ادارے کی نظر میں جنسی موضوعات پر کھل کر بات کرنا اخلاق سے گری ہوئی حرکت قرار پائے اور وہ یہ اصول بنا دے کہ اس ادارے کی سرپرستی میں کام کرنے والے مترجمین ماخذ متون کے اس طرح کے کسی حصے کو ترجمہ کرنے سے باز رہیں۔ اس کی ایک بڑی مثال مذہبی کتب کے تراجم شائع کرنے والے مقامی نجی ادارے ہیں، جہاں زیادہ تر عربی کتب — جیسے قرآن اور احادیث کی عربی کتب — کا اردو میں ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ ہر ادارے کے اپنے مذہبی عقائد و رجحانات ہوتے ہیں اور وہ اُسی ترجمے کو قبولیت کی سند عطا کرتا ہے جو ان عقائد کی پیروی کرتا ہے۔مختصراً یہ کہ سرپرستی کرنے والے ادارے فیصلہ کرتے ہیں کہ کن کتب کا ترجمہ ہونا ہے اور کیسے ہونا ہے۔ وہ کسی بھی ایسے ترجمے کو جو ان کے نظریات سے میل نہ کھاتا ہو شائع کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

دیگر ادبی شرکا کا عمل دخل (interference from other literary fellows/participants):

ناقدین اور ادب وترجمہ کے اساتذہ کرام وغیرہ تراجم اور مترجمین کے بارے میں لکھ کر ان کا ادبی حلقوں اور قارئین کی نظر میں ایک خاص امیج بنانے میں کردار ادا کرتے ہیں۔اسی طرح یہ ترجمے کے اچھا یا برا ہونے کے بارے میں معیارات متعین کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔اسدالدین صاحب کی خالد حسن کے منٹو کے افسانوں کے انگریزی تراجم پر تنقید کو، جس کا مختصر ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کی

مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔اس عمل میں ناقدین کی آرا کا کس قدر اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ اسد الدین صاحب کی تنقید کے بعد خالد صاحب نے منٹو کے تراجم کی اپنی نئی کتاب میں ان باتوں سے گریز کی شعوری کوشش کی جن پر اسد الدین صاحب نے تنقید کی تھی۔[۴۹]

مروج بوطیقا (established poetics):

اس سے مراد

۱۔ ادب کے بنیادی / روایتی اصول وضوابط ہیں جو طے کرتے ہیں کہ کسی ادب پارے کی ہیئت کیا ہوگی۔ان میں سب سے اہم 'صنف' ہے۔ ہر ادبی صنف کے اپنے لوازمات ہوتے ہیں — جیسے شاعری کے لیے قافیہ، ردیف، افسانے کے لیے اختصار اور سسپنس وغیرہ — اور لکھاری (بشمول مترجم) ان کی پیروی کرتا ہے۔

۲۔ کسی معاشرے میں رائج تصور ہے کہ ایک ادب پارے کا سماجی نظام (social system) میں کیا کردار ہوگا۔[۵۰] سماج میں راسخ تصورات،نظریات اور روایات وہ چپو ہیں جو ادب کی کشتی کو کھینچتے ہیں۔ یہ ایسی نادیدہ طاقتیں ہیں جو طے کرتی ہیں کہ کس قسم کے موضوعات کسی ادبی تحریر کا حصہ بن سکتے ہیں اور کس قسم کے موضوعات شجر ممنوعہ ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے پس منظر میں جو ادب پاکستان اور ہندوستان میں تخلیق ہوا اس کا بڑا حصہ ۱۹۴۷ء میں ہونے والے قتلِ عام کی ذمہ داری دوسرے ملک اور مذہب کے لوگوں پر تھوپتا اور اپنے ملک اور ہم مذہبوں کو معصوم بنا کر پیش کرتا ہے۔ ان تخلیقات پر قومیتی اور سماجی نظریات کا قوی اثر باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ چند ایک لوگ جنھوں نے اس رائج تصور کے خلاف لکھا، جیسے منٹو، انھیں عام لوگوں اور حکومت کی طرف سے پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سے مروج بوطیقا کی طاقت اور اثر پذیری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر معاشرے کی اپنی مخصوص بوطیقا ہوتی ہے اور کسی معاشرے میں رائج بوطیقا کوئی جامد شے نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک وقت تھا جب برصغیر پاک و ہند میں شاعری،خصوصاً غزل، کا طوطی بولتا تھا اور ہر خاص و عام اس لیلیٰ کا دیوانہ تھا۔ شعرا کے وظیفے مقرر تھے، انھیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن انیسویں اور بیسویں

صدی میں آہستہ آہستہ اس کی بجائے نثر زیادہ اہمیت اختیار کر گئی۔

مغربی ادب کی بات کی جائے تو کلاسیکیت، رومانیت اور حقیقت نگاری اس کی انتہائی اہم بوطیقائیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے اپنے اصول اور روایات ہیں، جو کہ ان کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں، مثال کے لیے، پہلی دو کا مختصر تعارف اور تقابل پیش کیا جا رہا ہے۔[۵۱]

کلاسیکی بوطیقا کی اساس استدلال (reasoning) اور عقلیت پسندی (rationalism) پر ہے۔ یونانی دور میں تشکیل پانے والی اس بوطیقا میں زور اس بات پر تھا کہ اگر کوئی شے عقلی اور استدلالی معیارات پر پوری اترے تو ٹھیک، ورنہ قابل اعتنا نہیں۔ مزید برآں، کائنات کی بنیاد ہی استدلال اور ہیئتیت پر ہے، اور یہ کہ کائنات مخصوص اصول وضوابط کے تابع ہے، جن کی جانکاری حاصل کر کے ہم کائنات کی گتھی سلجھا سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کو مخصوص اصول وضوابط کا پابند کیا گیا اور ان اصولوں کی پاسداری لکھاریوں کے لیے فرض ٹھہری۔ مثلاً، المیہ ڈرامے (tragic drama) کے لیے اتحادِ ثلاثہ (three unities) کا تصور دیا گیا؛[۵۲] اسی طرح اس کی بناوٹ کے لیے درج ذیل اجزا مخصوص کیے گئے:

افتتاحیہ (prologue)— جس میں کرداروں اور کہانی کا مختصر تعارف کروایا جاتا تھا۔

پیراڈوس (parados)— یہ بھی ایک مختصر سا تعارف تھا، لیکن یہ نثر کی بجائے غنائی شکل میں ہوتا تھا۔

عموماً تین سے پانچ اقساط (episodes)، اور ہر قسط کے ذیل میں چند مناظر (scenes)۔

ہر قسط کے اختتام پر کورس (چند گاہکوں کا گروہ) کی طرف سے ایک گانا۔

خروج (exodus)— یہ ڈرامے کا اختتامی منظر ہوتا تھا۔

اختتامی اوڈ (exode)— وہ گانا جو ڈرامے کے آخر میں کورس گاتا تھا اور جس میں کہانی سے حاصل ہونے والے کسی اخلاقی سبق کے بارے میں بات ہوتی تھی۔

اس طرح کے اور بھی اصول وضوابط ہیں جن پر عمل کرنا المیہ ڈرامے کے لکھاری پر لازم تھا۔ کلاسیکیت کے زیر سایہ ادب کی دیگر اصناف کے لیے بھی اسی طرح کے مخصوص اصول وضوابط مرتب

کیے گئے۔

کلاسیکیت کے ردِعمل میں یورپ میں رومانیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں جنم لینے والی اس بوطیقا میں استدلال اور عقلیت کی جگہ تخیل پسندی کا پرچار کیا گیا،[۵۳] اور ادب کی بنیاد تخیل (imagination) ، اجمالیت (aestheticism) اور ادب برائے ادب کے نظریے پر رکھی گئی۔ کائنات کو ایک منضبط (regulated) اور اسٹرکچرڈ (structured) شے کی بجائے ایک سربستہ راز کے طور پر لیا گیا، جس کے اسرار سے مکمل طور پر پردہ اٹھانا انسان کے بس میں نہیں۔ مزید برآں، لکھاری کو کئی اصولوں کا پابند کرنے کی بجائے ان کو آزادی سے کام کرنے دینے پر زور دیا گیا۔ رومانوی ادیب ایک آزاد پرندہ تھا، جو تخیل کے گھوڑے پر سوار دنیا جہان کی سیر کرتا پھرتا، اور جس کا مطمع نظر واقعات اور چیزوں کے بارے میں داخلی/ ذاتی (subjective) خیالات وجذبات کا اظہار تھا۔

درج ذیل جدول ان دو بوطیقاؤں کے ادب سے جڑے بنیادی تصورات ونظریات کو اختصار سے پیش کرتا ہے۔

کلاسیکیت		رومانیت
استدلال (reasoning) اور عقلیت پسندی (rationalism)		تخیل (imagination)، جمالیت (aestheticism) اور ادب برائے ادب
معروضیت		ذاتیت
سخت ادبی قوانین		طریقۂ اظہار کی آزادی

(جدول ۴: کلاسیکی اور رومانوی بوطیقائی نظریات کا تقابل)

رائج بوطیقا کا دیگر ادبی تحریروں کے ساتھ ساتھ ترجمے پر بھی گہرا اثر ہوتا ہے کیونکہ دیگر لکھاریوں کی طرح مترجم کو اس کے اصولوں کی پاسداری کرنا ہوتی ہے، اور یہ بھی انعطافی ترجمے کا سبب بنتا ہے۔

لسانیاتی پابندی (linguistic constraint):

ہر زبان کی اپنی خاص لسانیاتی ترکیب ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو دونوں کا لسانیاتی تفاوت فطری طور پر ترجمے میں تبدیلیوں (کیونکہ مترجم کو ماخذ

زبان کی ساختی ترتیب کو ہدفی زبان کی ساختی ترتیب میں ڈھالنا ہوتا ہے)، اور نتیجتاً انعطافی ترجمے، کا باعث بنتا ہے۔

مترجم کے نظریات (ideology):

ہر ترجمہ کرنے والے کے دنیا اور اس کے معاملات کے بارے میں ذاتی نظریات و اعتقادات ہوتے ہیں، اور ان کا غیر محسوس طور پر اس کی سائیکی پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے، لاکھ کوشش کے باوجود یہ نظریات ترجمے میں سرایت کر جاتے ہیں، جن سے ترجمہ ماخذ متن کے لکھاری اور مترجم کے نظریات کا مرکب بن کر سامنے آتا ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور ساختی ترتیب کے عمیق مطالعے سے کسی ترجمے میں مترجم کے نظریات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۔ مابعد نو آبادیاتی ترجمہ (postcolonial translation):

سوسن بیسنٹ اور آندرے لیفیور کی ۱۹۹۰ء میں مرتب کردہ کتاب *Translation, History and Culture*[۵۴] نے ترجمے کی ثقافتی تحقیق کے کئی در وا کیے۔ ان میں سے ایک مابعد نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے ترجمے کا مطالعہ تھا۔ اس نوع کا مطالعہ کرنے والے اولین دانشمندوں میں بنگالی نقاد گائتری سپیوک (Gayatri Spivak) (۱۹۴۲ء) کا کام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۹۳ء میں لکھے گئے اپنے مقالے "The Politics of Translation" میں اس نے جائزہ لیا کہ ترجمے کے عمل پر نو آبادیاتی دور کے آقاؤں اور ان کی زبانوں کا کتنا طاقتور اثر ہوا۔[۵۵] اس کے مشاہدے کے مطابق بنگالی (یا کوئی بھی ایسی زبان جو غلام ممالک میں بولی جاتی تھی) سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے مترجم حتی الوسع کوشش کرتا ہے کہ ترجمہ طاقتور زبان، یعنی انگریزی، کے لسانی اور ثقافتی اصول و ضوابط میں مکمل طور پر ڈھل جائے۔ چنانچہ کوشش کی جاتی ہے کہ ماخذ متن کے ثقافتی حوالوں کو ہدفی ثقافت، یعنی انگریزی ثقافت، کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔

محققین نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ کس طرح ترجمے کو یورپی حاکم قوتوں نے اپنے تسلط کو فروغ دینے کے لیے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا۔[۵۶] اس کی ایک واضح مثال ۴ مئی ۱۸۰۰ء[۵۷] کو برصغیر میں قائم ہونے والے فورٹ ولیم کالج کی ہے۔ انگریزوں کی طرف سے اس کالج کو بنانے کا

مقصد یہ تھا کہ برصغیر میں جو انگریز افسر کام کر رہے تھے انھیں اردو سکھائی جائے،[۵۸] تا کہ وہ کارِ سرکار مقامی زبان میں انجام دے سکیں اور مقامی لوگوں اور ان کی ثقافت کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں، اور اس طرح سے ان کو اپنا تسلط برقرار رکھنے میں مدد ملے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کالج کی طرف سے اردو مترجمین کو ملازمتیں دی گئیں اور ان کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ فارسی کی داستانوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کریں۔[۵۹] یہ تراجم اردو سیکھنے والے انگریز افسروں کی اردو میں استطاعت بڑھانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

۳۔ ترجمہ اور جنس (translation and gender):

اس دور میں ترجمے کا مطالعہ جنس کے نقطۂ نظر سے بھی کیا جانے لگا۔ اس مطالعے کے مختلف پہلو ہیں، جن میں سے ایک یہ دیکھنا ہے کہ ترجمے میں جنس کو کیسے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سطور پڑھتے ہوئے یقیناً ادب اور لسانیات کے طالب علموں کے اذہان میں ایک ہی نام گونج رہا ہوگا، یعنی نظریۂ حقوقِ نسواں (feminism)۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اس نظریے کا کلیدی نکتہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے، اور انھوں نے زندگی کے ہر پہلو میں خواتین کو دباؤ میں رکھا ہوا ہے۔ اس نظریے کے تحت چلنے والی تحریک آزادیِ نسواں کا ارتکاز اس بات پر ہے کہ خواتین کے ساتھ جاری امتیازی سلوک کو اجاگر کیا جائے اور معاشرے میں ان کی حیثیت میں بہتری لائی جائے۔ اس تحریک کا ایک تحقیقی جز ادب میں خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک پر بحث کرتا رہا ہے، جس کا دائرہ وسیع ہوتے ہوئے ۹۰ کی دہائی میں ادبی تراجم تک آن پہنچا، اور تحقیق کا ایک پسندیدہ موضوع یہ بن گیا کہ جائزہ لیا جائے کہ ادبی تراجم میں کیسے لسانی طور پر خواتین کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز محقق کو اس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ کسی کمیٹی کے سربراہ کے لیے 'چیئرمین'، یعنی ایسا نام جس میں تجنیس مرد کو مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اس کی بجائے، اس کی ترجیح یہ ہوگی کہ 'چیئرپرسن' کا لفظ استعمال کیا جائے، جس میں مرد کی جنس کو فوقیت دینے کی بجائے دونوں جنسوں، یعنی مرد اور عورت، کے لیے ایک غیر جانبدارانہ لفظ استعمال ہو۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نظریۂ حقوقِ نسواں کے تحت کام کرنے والی خواتین مترجمین نے جانتے بوجھتے

ایسے تراجم کیے جن میں ماخذ کے ایسے الفاظ کو جن میں جنس مرد کو مرد اور عورت دونوں کی نمائندگی کے لیے استعمال کیا گیا تھا (جیسے man، mankind اور policeman) ترجمے میں غیر جانبدارانہ الفاظ سے بدل دیا گیا۔ اس کی ایک مثال بائبل کے وہ تراجم ہیں جن میں مترجمین نے جہاں جہاں مردانہ الفاظ استعمال کیے ہیں انھیں غیر جانبدارانہ الفاظ سے بدل دیا۔[۶۰] کچھ خواتین نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے جارحانہ رویہ اپنایا اور ماخذ کی تحاریر کا ترجمہ ایسے انداز میں کیا کہ ترجمہ خواتین کے نقطۂ نظر/خیالات کو اجاگر کرے۔[۶۱]

۴۔ ترجمے کو اپنا اور پرایا بنانا (domestication and foreignization of translation):[۶۲]

لارنس وینوٹی (۱۹۵۳ء) نے ترجمے کے ضمن میں ثقافتی نقطۂ نگاہ سے دو بنیادی تکنیکوں کا ذکر کیا، جنھیں ہم ترجمے کو اپنانا اور پرایا بنانا کہہ سکتے ہیں۔ اول الذکر تکنیک میں مترجم ماخذ متن کی لسانی بُنت اور ثقافتی حوالوں کو ہدفی لسانیات اور ثقافت کے پیکر میں ڈھالتا ہے، یعنی ایک غیر ملکی زبان میں لکھی تحریر کو ہدفی زبان و ثقافت کے قواعد و روایات کا پابند کر دیتا ہے، کچھ اس طرح سے کہ جو قارئین اس بات سے واقف نہ ہوں کہ یہ کسی اور زبان سے کیا گیا ترجمہ ہے ان کی نظر میں یہ ہدفی زبان میں لکھی گئی اصل (original) تحریر ہوگی۔ یہ ایک مشہور تکنیک ہے کیونکہ اس سے ہدفی متن کے قاری کو ترجمے سے اپنی ثقافت کی بُو آتی ہے اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور قارئین اور ناقدین دونوں عموماً ایسے ترجمے کو سندِ قبولیت بخشتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک پاکستانی مترجم کرسمس کے پس منظر میں لکھے گئے کسی انگریزی افسانے کو اردو میں ترجمہ کرتا ہے۔ اگر ایسا کرتے ہوئے وہ انگریزی ناموں کو اردو ناموں سے اور کرسمس کے حوالوں کو عید کے حوالوں سے بدل دیتا ہے تو یہ 'اپنانا' کی تکنیک کی ایک واضح مثال ہو گی۔ اس کے برخلاف، ترجمے میں ماخذ کے ثقافتی اور لسانیاتی حوالوں کو جانتے بوجھتے برقرار رکھنا کہ جس سے صاف پتہ چلے کہ پڑھی جانے والی تحریر کسی دوسری زبان سے کیا گیا ترجمہ ہے کو 'پرایا بنانے' کی تکنیک کہا جائے گا۔ وینوٹی اس تکنیک کا حامی اور وکیل ہے، کیونکہ اس کے خیال میں اپنا بنایا ہوا ترجمہ مترجم کی شناخت کو چھپا دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹاتا ہے۔ اس لیے وہ مترجمین کو ترغیب دیتا ہے کہ

وہ جان بوجھ کر تراجم میں بیرونی الفاظ اور ثقافتی حوالوں کا استعمال کریں تا کہ قاری کو واضح طور پر پتہ ہو کہ تحریر ماخذ متن کے مصنف کی تخلیق نہیں، بلکہ مترجم کے تخلیقی قلم سے نکلا ترجمہ ہے۔

اختتامیہ:

ترجمے کے جدید نظریات سے مقامی قارئین کو روشناس کروانے کے لیے اس آرٹیکل میں پانچ نظریاتی رجحانات اور ان کے بنیادی ذیلی نظریات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ابتدا قبل لسانیاتی دور سے کی گئی جس کے تحت لفظی اور معنوی تراجم کے نظریات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا۔ اس کے بعد لسانیاتی دور کی تفصیل میں سیاقی اور بے سیاقی تحقیقی رجحانات نیز نیڈا کے ہیئتی اور حرکی مساوات اور پیٹر نیو مارک کے معنوی اورابلاغی ترجمے کے نظریات کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اسی طرح توضیحی رجحان کے ضمن میں کثیر نظامی نظریہ، معیاراتِ ترجمہ، ترجمے کی عالمگیر خصوصیات اور عمل سمتی رجحان جیسے اساسی موضوعات، اور تفاعلی رجحان کی ذیل میں اس کے چار اساسی محققین یعنی کیتھرینا رائس، جُستا ہولز منٹیری، ہانس ورمیئر اور کرسٹیانا نارڈ کے نظریات پر مختصر بحث کی گئی۔ آخر میں ثقافتی رجحان کے تحت ترجمے کو مکرر تحریر کے طور پر پیش کرنے کے تصور، مابعد نو آبادیاتی ترجمہ، ترجمہ اور جنس اور ترجمے کو اپنانے یا پرایا بنانے کے کلیدی نظریات و رجحانات کا تعارف پیش کیا گیا ہے (موضوع کے پھیلاؤ کے باعث چند موضوعات پر قلم اٹھانے سے اس ابتدائی نوعیت کی تحریر میں احتراز برتا گیا ہے، جیسے ترجمے کا ادراکی اور ہرمینیوٹک (hermeneutic) مطالعہ)۔

حواشی و تعلیقات

* پی ایچ ڈی ٹرانسلیشن اسٹڈیز اسکالر یونی ورسٹی اوف لیڈز، ویسٹ یارکشائر، یو کے۔

۱۔ پیٹر نیو مارک (Peter Newmark)، *Approaches to Translation* (اوکسفرڈ اور نیو یارک: پرگیمن، ۱۹۸۱ء)۔

۲۔ سوزن بیسنٹ (Susan Bassnett)، *Translation Studies* (لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۱۹۸۰ء)؛ آندرے لیفیور (Andre Lefevere)، *Translation, Rewriting and the Manipulation of Literary Fame* (اوکسفرڈ اور نیو یارک: پرگیمن، ۱۹۹۲a ء)؛ ایضاً، *Translation / History / Culture: A Sourcebook* (لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۱۹۹۲b ء)؛

ہانس جے ورمیر (Hans J. Vermeer)، "Skopos and Commission in Translational Action" مشمولہ *The Translation Studies Reader* مرتب لارنس وینوٹی (Lawrence Venuti) (لندن اور نیو یارک: رُٹلیج، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۲۱-۲۳۲؛

لارنس وینوٹی (Lawrence Venuti)، *The Translator's Invisibility: A History of Translation* (لندن اور نیو یارک: رُٹلیج، ۱۹۹۵ء)۔

۳۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ راقم کی پی ایچ ڈی کی تحقیق میں نظریہ سکوپوس (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لیے یہاں اسی نظریے کی تقلید کرتے ہوئے ترجمہ کی جانے والی تحریر کے لیے 'ماخذ متن' اور اس کے ترجمے کے لیے 'ہدفی متن' کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ یاد رہے کہ دیگر تحقیقی رجحانات کے تحت کام کرنے والوں میں ان اصطلاحات کے لیے مختلف نام مستعمل ہیں، جن میں سب سے قدیم اور عام فہم شاید 'اصل متن' اور 'ترجمہ شدہ متن' کی اصطلاحات ہیں۔

۴۔ سسرو رومی دور کا مشہور فلسفی، سیاستدان اور مقرر تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی تصانیف کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اہلِ یورپ پہلی مرتبہ نشاۃ الثانیہ یعنی Renaissance (چودھویں صدی کی وہ مشہور علمی تحریک جس نے یورپ کو یونانی اور رومن فلسفہ، سائنس، ادب وغیرہ سے روشناس کروایا) کے دوران اس کی تصانیف سے متعارف ہوئے، اور ان کے ادب و فلسفہ پر سسرو کے خیالات کا گہرا اثر ہوا۔ ترجمے کے بارے میں اس کے خیالات ۴۶ قبل مسیح میں لکھی جانے والی *De Optimo Genere Oratorum* (بہترین مقررین کے بارے میں) میں ملتے ہیں۔ یہ اصل میں ایک ایسی کتاب کا دیباچہ ہے جس میں اس نے دو مشہور ایٹک مقررین، Demosthenes اور Aeschines، کی تقاریر کا یونانی سے رومن میں ترجمہ کیا۔ حوادثِ زمانہ کے سبب ترجمہ شدہ تقاریر تو ہم تک نہیں پہنچ پائیں لیکن یہ دیباچہ محفوظ رہ گیا۔ اس دیباچے میں سسرو نے اس حکمتِ عملی کا تذکرہ کیا ہے جو اس نے ایٹک مقررین کی تقاریر کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنائی تھی۔ یہ حکمتِ عملی آزاد ترجمے کی تھی جس میں اس نے لفظی ترجمے کی بجائے ماخذ متن کے معنی / پیغام اور اسلوب کو ترجمہ کرنے پر توجہ دی۔

۵۔ فنِ خطابت (rhetoric) یونانی دور میں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اگر اسے ایک عام فہم تمثیل سے سمجھانے کی کوشش کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھے مقرر کی یونانی معاشرے میں وہی حیثیت اور عزت تھی جیسی آج کل ہمارے معاشرے میں انگریزی میں مہارت رکھنے والے کی ہوتی ہے۔ ایٹک مقررین (۵ صدی قبل مسیح سے ۴ صدی قبل مسیح)، جو تعداد میں دس تھے، وقت کے بہترین خطیب تھے۔ یہ سادہ اور عام فہم تقاریر کے قائل تھے، یعنی ایسی تقاریر جو عام آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکے۔ ان کے نظریات اور تقاریر نے یونان میں فنِ خطابت کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔

قارئین کے ذہنوں میں یہ سوال بھی ہوگا کہ آخر انھیں ایٹک مقررین کیوں کہا جاتا ہے۔ وجہ کچھ یوں ہے کہ اس دور میں یونان کے ادبی لحاظ سے مشہور شہر ایتھنز (Athens) کے اردگرد کا علاقہ ایٹکا (Attica) کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ ایتھنز کی عملداری میں تھا، اور چونکہ اوپر مذکور دس مقررین کا تعلق اسی علاقے سے تھا اس لیے انھیں تاریخ میں ایٹک مقررین کے نام سے جانا جاتا ہے۔

۶۔ باسل حاتم (Basil Hatim) اور جیریمی منڈے (Jeremy Munday)، *Translation: An Advanced*

Resourcebook (لندن: رُوٹلیج، ۲۰۰۴ء)، ص۱۱۔

۷۔ لوری باؤر (Laurie Bauer)، *The Linguistics Student's Handbook* (ایڈنبرا: ایڈنبرا یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء)، ص۴۔

۸۔ ڈی ساسیور کی اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے زبان کا مطالعہ انیسویں صدی میں تاریخی پس منظر میں کیا جاتا تھا، اور یہ علم فلالوجی (Philology) کہلاتا تھا۔ اس کے تحت، مختلف زبانوں کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے پرانی تحریروں اور تہذیبوں کا مطالعہ کیا جاتا اور زبانوں میں مماثلتیں تلاش کی جاتیں۔ ان مماثلتوں کی بنیاد پر زبانوں کے خاندان/ گروہ بنائے جاتے، جن میں سب سے بڑا خاندان انڈو یورپئین (Indo-European) کہلاتا ہے۔ اس میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی اور ہسپانوی وغیرہ شامل ہیں۔ اگرچہ ساسیور نے اوائل عمری میں اسی تحقیق کو مشعلِ راہ بنایا، لیکن جلد ہی اس نے بحث کا رُخ ایسے سوالات کی طرف موڑ دیا جیسے زبان کا تشکیل کیا ہے، اس کے اجزا کون کون سے ہیں، زبان اور ماحول کا باہمی تعلق کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان اختراعی نوعیت کے خیالات کا اظہار اس نے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء کے دوران جامعہ جنیوا (University of Geneva) میں لسانیات پر دیے گئے اپنے ۳ لیکچرز میں بھی کیا۔ یہ ان لیکچرز کے دوران لیے گئے نوٹس ہی تھے جنھیں ساسیور کے طالب علموں چارلس بیلی (Charles Bally)، جو بعد ازاں خود بھی ایک مشہور محقق اور اسکالر کے طور پر سامنے آیا، اور البرٹ سیچیہائے (Albert Sechehaye) نے اپنے استاد کی وفات کے بعد کتابی شکل میں چھپوایا، اور اس کتاب کو *A Course in General Linguistics* کا عنوان دیا۔ یہ وہی مشہور و معروف کتاب ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس نے لسانیات کی دنیا میں جدید نظریات کو متعارف کروایا۔

۹۔ چونکہ اس تحریر کا دائرۂ کار محدود ہے، اس لیے اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ کسی لفظ یا فقرے کے ناقابلِ ترجمہ ہونے کا یہ تصور کتنا جاندار ہے۔

۱۰۔ ان حضرات کے تصورات کی مکمل نمائندہ درج ذیل کتب ہیں:

ژاں پال وِنے (Jean-Paul Vinay) اور ژاں ڈاربلنے (Jean Darbelnet)، *Comparative Stylistics of French and English: A Methodology for Translation*، مترجم اور مرتب جوآن سی سیگر (Juan C. Sager) اور ایم جے ہمل (M. J. Hamel) (ایمسٹرڈیم: جان بنجمز پبلشنگ، ۱۹۹۵ء)۔

جے سی کیٹفورڈ (J. C. Catford)، *A Linguistic Theory of Translatiion: An Essay in Applied Linguistics* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء)۔

۱۱۔ غیر ضروری تفصیل سے اجتناب برتتے ہوئے ان سات حکمتِ عملیوں کی تفصیل بیان نہیں کی جا رہی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں اردو میں چھپنے والی کتاب میں کافی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ فاخرہ نورین، *ترجمہ کاری* (اسلام آباد: ادارہ تحقیقاتِ اردو، ۲۰۱۴ء)، ص۵۵–۶۰۔

۱۲۔ نیڈا کی تحقیق و نظریات کو جاننے کے لیے درج ذیل دو کتب اہم ہیں:

یوجین نیڈا (Eugene Nida)، *Toward a Science of Translating* (لیڈن: ای جے برل، ۱۹۶۴ء)۔

یوجین نیڈا (Eugene Nida) اور سی آر ٹیبر (C. R. Taber)، *The Theory and Practice of Translation* (لیڈن: ای جے برل، ۱۹۶۹ء)۔

۱۳۔ نیومارک کے کام کی تفصیل درج ذیل کتب میں دیکھی جا سکتی ہے:

پیٹر نیو مارک (Peter Newmark)، *Approaches to Translation*؛ *A Textbook of Translation* (نیو یارک اور لندن: پرینٹس ہال، ۱۹۸۸ء)۔

۱۴۔ ڈی ساسیور کی طرح نوم چومسکی کو بھی بابائے لسانیات کہا جاتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں فلاڈلفیا امریکا میں پیدا ہونے والے اس عظیم مفکر و محقق نے بچپن اور لڑکپن میں ہی اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں اس نے پینسلوینیا یونی ورسٹی سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کی، اور اس کا مقالہ ۱۹۵۷ء میں کتابی شکل میں چھپ کر دنیا کے سامنے آیا۔ یہ ایک ایسی تہلکہ خیز تحریر تھی جس نے لسانیات میں ہونے والی تحقیق کا راستہ موڑ دیا۔ اب تک ڈی ساسیور کے زیر اثر لسانیات پر کرداریت پسندانہ (behaviouristic) تحقیق کی جا رہی تھی جب کہ چومسکی نے ادراکی (cognitive) تحقیق کا آغاز کیا۔ اس کی دلچسپی یہ جاننے میں تھی کہ زبان کے استعمال میں انسانی دماغ کیسے کارروائی (processing) کرتا ہے۔ اس ضمن میں اس نے دو تصورات پیش کیے: قابلیت (competence) اور کارکردگی (performance)۔ اول الذکر سے مراد زبان کے بارے میں مکمل معلومات (complete/absolute knowledge) ہیں جو ایک مثالی مقرر اور سامع (ideal speaker and listener) کے ذہن میں ہوتی ہیں۔ زبان کا مثالی استعمال کنندہ (ideal user) وہ خیالی انسان ہے جو بشری کمزوریوں، جیسے محدود یادداشت اور لسانی لغزشوں، سے پاک ہوتا ہے، اور زبان کے مکمل صوتیاتی (phonetic)، ساختی (structural) اور لفظی و معنوی (lexical & semantic) علم کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کارکردگی سے مراد اس مکمل علم کا وہ حصہ ہے جس کا کوئی انسان عملاً روزمرہ زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ چومسکی کے مطابق قابلیت، جسے شاید لسانی قابلیت کہنا زیادہ بہتر ہوگا، کی اہمیت کارکردگی سے کہیں زیادہ ہے اور اس کو سمجھنے سے ہمیں انسانی دماغ میں زبان کے ارتقا و انعال کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ زبان کے ادراکی انعال کو سمجھانے کے لیے اس نے سطحی ترکیب اور عمیق ترکیب کے تصورات دیے، جن کی مختصر تفصیل ذیل کے حاشیے میں دی جا رہی ہے۔

۱۵۔ سطحی ترکیب سے مراد کسی فقرے کی ظاہری صورت ہے جو ہم سطحِ قرطاس، کمپیوٹر اسکرین وغیرہ پر دیکھتے ہیں یا خود بولتے یا کسی کو بولتے سنتے ہیں جب کہ عمیق ترکیب وہ زیر سطحی صورت (underlying form)، وہ خام مال، ہے جو انسانی دماغ میں جنم لیتا ہے اور کسی فقرے کے اصل / بنیادی معنی، یا یوں کہہ لیجیے کہ بنیادی 'فسِ مضمون'، کا نمائندہ ہوتا ہے۔ درج ذیل مثالوں پر غور کیجیے:

اندر آیئے۔

آپ اندر آیئے۔

سطحِ قرطاس پر یہ دو مختلف فقرات ہیں، لیکن چومسکی کے نظریے کے مطابق ان دونوں کی عمیق ترکیب ایک ہی ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ ان دونوں میں ایک ہی فعل، یعنی 'اندر آنے کی دعوت'، انجام دی جا رہی ہے۔ ایک اور مثال لیجیے:

کل میں لاہور جاؤں گا۔

میں کل لاہور جاؤں گا۔

میں لاہور کل جاؤں گا۔

یہاں بھی تین مختلف ظاہری صورتیں ہیں، لیکن ان سب کی عمیق ترکیب ایک ہی ہے یعنی کا ہو رہا جانے کے ارادے کا اظہار؛ یہ عمیق ترکیب مقرر کے ذہن میں موجود ہوتی ہے جسے وہ سیاق وسباق کے مطابق مختلف ظاہری صورتوں میں ڈھالتا ہے۔

۱۶۔ یوجین نیڈا (Eugene Nida) اور سی آر ٹیبر (C. R. Taber)، *The Theory and Practice of Translation*، ص ۳۳۔

۱۷۔ سوسانا وڈیاسٹوٹی (Susana Widyastuti) نے اس عمل کی وضاحت یوں کی ہے:

> "...words can be classified according to shared and differentiating features. Breaking down the sense of a word into its minimal distinctive features, componential analysis of meaning can be a useful approach in the study of meaning, particularly in determining the meaning of a lexeme."
>
> ''......الفاظ کو مشترکہ اور امتیازی خصوصیات کی بنیاد پر زمرہ بند کیا جا سکتا ہے۔ کسی لفظ کے معنی کو اس کی انتہائی چھوٹی امتیازی خصوصیات میں تقسیم کرنے کی خصوصیت کے باعث جزیاتی تحلیل معنی کے مطالعے کے لیے ایک اہم ترکیب ثابت ہو سکتی ہے، خصوصاً کسی لیکسیم (یعنی لفظ اور اس سے مشتق تمام وضعیں) کے معنی سمجھنے کے لیے۔''

حوالہ: سوسانا وڈیاسٹوٹی (Susana Widyastuti)، ''Componential Analysis of Meaning: Theory and Application'' مشمولہ *Journal of English and Education* شمارہ ۴ (۲۰۱۰ء): ص ۱۱۶–۱۲۸۔

۱۸۔ جے اے نوڈے (J. A. Naudé)، ''An Overview of Recent Developments in Translation Studies With Special Reference to the Implications for Bible Translation'' مشمولہ *Acta Theologica Supplementum* ۲، (۲۰۰۲ء)، ص ۴۲–۶۳۔

۱۹۔ مارک شٹل ورتھ (Mark Shuttleworth)، ''Polysystem Theory'' مشمولہ *Routledge Encyclopedia of Translation Studies*، مرتب مونا بیکر (Mona Baker) (لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۷۶۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ترجمے میں نظریاتی خسارے (اور لسانیاتی، ثقافتی، جمالیاتی، نفسیاتی وغیرہ خساروں) کا موضوع عمیق اور تہ دار ہونے کے ناتے ایک علاحدہ تحقیقی مطالعے کا متقاضی ہے، اور چونکہ یہ آرٹیکل اس کا کما حقہ احاطہ نہیں کر سکتا اس لیے یہاں اس پر مزید بحث نہیں کی جا رہی۔

۲۲۔ اگرچہ چند خواتین و حضرات — مثلاً مرزا حامد بیگ، عابد سیال اور خالد فیاض صاحبان اور فاخرہ نورین صاحبہ — اور اداروں — جیسے مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات — نے ترجمے کی اشاعت و تحقیق میں کردار ادا کیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مستثنیات کو چھوڑ کر ادبی حلقوں، ناشروں اور قاری کی نظر میں مجموعی طور پر ترجمہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ علم ترجمہ پر تحقیق کا کال نظر آتا ہے۔

۲۳۔ گڈیئن ٹوری (Gideon Toury)، *Descriptive Translation Studies and Beyond* (ایمسٹرڈیم اور فلیڈلفیا: جان بنجمنز، ۱۹۹۵ء)۔

۲۴۔ ترجمے کے ضمن میں یہ تصور ٹوری نے اپنے آرٹیکل "The Nature and Role of Norms in Translation Studies" میں سب سے پہلے پیش کیا۔ اس کا آرٹیکل ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آنے والی اس کی کتاب In Search of a Theory of Translation میں چھپا۔ یہی آرٹیکل کچھ اضافوں کے ساتھ اس نے ۱۹۹۵ء کی اپنی محولہ بالا مشہور کتاب میں چھاپا۔

۲۵۔ گڈیئن ٹوری (Gideon Toury)، *Descriptive Translation Studies and Beyond*، ص ۵۶–۵۷۔

۲۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

رائلا ہیکانن (Raila Hekkanen)، "Direct Translation – Is it the only Option? Indirect Translation of Finnish Prose Literature into English" مشمولہ *True North: Literary Translation in the Nordic Countries* مرتب بی جے ایپسٹین (B. J. Epstein) (نیو کاسل اپان ٹائن: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۷–۴۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۸۔

۲۸۔ یہ حکمت عملیاں عملیاتی معیارات کے ذیل میں مادی معیارات (matricial norms) کے تحت آتی ہیں، لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ذیلی معیارات کی تفصیل سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۲۹۔ خالد حسن پیشہ کار صحافی اور لکھاری تھے۔ منٹو کے کام کے ترجمے کے ضمن میں ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی اور مترجم سے کہیں بڑھ کر منٹو کی تحریروں کا ترجمہ کیا۔ منٹو کے انگریزی تراجم پر مشتمل ان کی کتابوں میں شامل ہیں: *Kingdom's End*, *A Wet Afternoon*, *Manto's Panorama*, *Manto's World*۔

۳۰۔ اسد الدین محمد، "Manto Flattened: An Assessment of Khalid Hasan's Translations" مشمولہ *Annual of Urdu Studies* جلد ۱۱ (۱۹۹۶ء)، ص ۱۳۳۔

۳۱۔ غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے ان محققین کے کاموں کی تفصیل بیان کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۳۲۔ کرسٹن میلم کیئر (Kirsten Malmkjær)، "Norms and Nature in Translation Studies" مشمولہ *Incorporating Corpora: The Linguist and the Translator* مرتب گنیلا اینڈرمین (Gunilla Anderman) اور مارگریٹ راجرز (Margret Rogers) (برسٹل: ملٹی لنگول میٹرز، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۳۔

۳۳۔ مونا بیکر (Mona Baker)، "Corpus Linguistics and Translation Studies: Implications and Applications" مشمولہ *Text and Technology: In Honour of John Sinclair* مرتب مونا بیکر (Mona Baker)، گل فرانسس (Gill Francis) اور ٹوگنینی–بونیلی (Tognini-Bonelli) (ایمسٹرڈیم اور فلیڈلفیا: جان بنجمنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۲۳۳–۲۵۰۔

۳۴۔ مونا بیکر کے اس مقالے نے جو زیادہ اہم کام کیا وہ ترجمے کی تحقیق میں کارپس (corpus) کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ یہ چونکہ ہمارے موضوع سے نسبت نہیں رکھتا اس لیے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا جائے گا (اس کی تفصیل ترجمے کے تحقیقی ماڈلز

(research models) یا آلات (tools) کے ذیل میں کسی اور آرٹیکل میں بیان کی جائے گی)۔

۳۵۔ پریچٹ کا یہ ترجمہ کولمبیا یونی ورسٹی کی ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔ اس تک رسائی حسب ذیل لنک سے کی جا سکتی ہے:
http://www.columbia.edu/itc/mealac/pritchett/00urdu/tobateksingh/translation.html

۳۶۔ پال کسمال (Paul Kussmaul) اور سونجا ٹرکونن کونڈٹ (Sonja Tirkkonen-Condit)، "Think-Aloud Protocol Analysis in Translation Studies" مشمولہ *TTR: Traduction, Terminologie, Rédaction* جلد ۸ (۱۹۹۵ء)، ص ۱۷۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۳۸۔ رائس کے نظریات سے مزید آگاہی کے لیے درج ذیل کتاب دیکھیے جو ۱۹۷۱ء میں جرمن زبان میں لکھی گئی اس کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے:

کیتھرینا رائس (Katherina Reiss)، *Translation Criticism: Potentials and Limitations* مترجم ای ایف رہوڈز (E. F. Rhodes) (مانچسٹر: سینٹ جیروم اینڈ امریکن بائبل سوسائٹی، ۲۰۰۰ء)۔

۳۹۔ بوہلر نے ۱۹۳۴ء میں چھپی اپنی مشہور زمانہ کتاب *Sprachtheorie* (جس کا انگریزی میں ترجمہ ڈونلڈ فریزر گڈون (Donald Fraser Goodwin) نے ۱۹۹۰ء میں Theory of Language: The Representational Function of Language کے عنوان سے کیا) میں زبان کے یہ تین افعال بیان کیے: اظہار (expression)، ترغیب (appeal) اور نمائندگی (representation)۔ ان کو بنیاد بنا کر رائس نے وہ تین متنی اقسام بیان کیں جن کا ذکر اس آرٹیکل میں آیا ہے۔

۴۰۔ ہولز منیتیری کے نظریات کو سمجھنے کے لیے اس کی درج ذیل کتاب انتہائی اہم ہے البتہ راقم کی معلومات کے مطابق اس کا ابھی تک انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا گیا:

جسٹا ہولز منیتیری (Justa Holz-Mänttäri)، *Translatorisches Handeln: Theorie und Methode* (ہیلسنکی: Suomalainen tiedeakatemia، ۱۹۸۴ء)۔

۴۱۔ ہانس جے ورمیئر (Hans J. Vermeer)، "Skopos and Commission in Translational Action"، ص ۲۲۱۔

۴۲۔ جیریمی منڈے (Jeremy Munday)، *Introducing Translation Studies: Theories and Applications* (لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۲۰۰۱ء)، ص ۷۷۔

۴۳۔ ورمیئر کی ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آنے والی اس مشہور کتاب کا حال ہی میں چھپنے والا انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے جس میں اس نے اپنے سکوپوس کے نظریے کو تفصیل سے بیان کیا۔ رائس کے تعاون سے لکھی گئی اس کتاب کا آدھا حصہ ورمیئر کے نظریات اور باقی آدھا رائس کے نظریات پر مشتمل ہے۔

کیتھرینا رائس (Katherina Reiss) اور ہانس جے ورمیئر (Hans J. Vermeer)، *Towards a General Theory of Translational Action: Skopos Theory Explained* مترجم کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord) (لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۲۰۱۴ء)۔

۴۴۔ کرسٹیانا نارڈ کی درج ذیل دو کتابیں اس کے نظریات کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں:

Translating as a Purposeful Activity: Functionalist Approaches Explained (مانچسٹر: سینٹ جیروم، ۱۹۹۷ء)؛ *Text Analysis in Translation: Theory, Methodology and Didactic Application of a Model for Translation-Oriented Text Analysis* (ایمسٹرڈیم اور نیو یارک: روڈوپی، ۲۰۰۵ء)۔

۴۵۔ سوزن بیسنٹ (Susan Bassnett) اور آندرے لیفیور (André Lefevere) (مرتبین)، *Translation, History and Culture* (لندن اور نیو یارک: پنٹر، ۱۹۹۰ء)۔

۴۶۔ لیفیور ترجمے کے علاوہ تنقید، ترمیم، تاریخ نویسی (historiography) اور ادبی مجموعہ بندی (anthologizing) کو بھی تحریرِ نو کے ضمن میں لیتا ہے۔

۴۷۔ لیفیور نے ان مختلف عوامل کو اپنی درج ذیل کتاب میں انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے:

آندرے لیفیور (André Lefevere)، *Translation, Rewriting and the Manipulation of Literary Fame* (لندن اور نیو یارک: برجیمن، ۱۹۹۲a)۔

۴۸۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا سے اردو سے ۱۹۷۵ء تک (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء)، ص ۴۲۔

۴۹۔ خالد حسن کے اپنے الفاظ میں:

> I have revised several of my earlier translations, some in order to deal with the charge made by one Indian critic that I had 'summarized' certain passages in certain stories, instead of translating them literally, word for word. I hope no fault will be found on that count — for now at least — with what this book contains.
>
> میں نے اپنے کئی سابقہ تراجم پر نظرِ ثانی کی ہے کچھ پر اس لیے تاکہ میں ایک ہندوستانی ناقد کی اس تنقید سے نبرد آزما ہو سکوں کہ میں نے کچھ افسانوں کے چند حصوں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی بجائے ان کو 'ملخص' کر دیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مشمول میں ایسی کوئی خامی نہیں پائی جائے گی۔

خالد حسن (مترجم)، *Bitter Fruit: The Very Best of Saadat Hasan Manto* (نیو دہلی: پینگوئن، ۲۰۰۸ء)۔

۵۰۔ رین شو پنگ (Ren Shuping)، "Translation as Rewriting" مشمولہ *International Journal of Humanities and Social Science*، ۳ (اکتوبر ۲۰۱۳ء): ص ۵۸۔

۵۱۔ یہ دونوں بوطیقائیں کس قدر اہم ہیں اس کا اندازہ ڈاکٹر انور سدید کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے: "دنیا کے بیشتر ادب کی تقسیم انھیں دو تحریکوں کے حوالے سے کی گئی ہے"۔ اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا سے اردو سے ۱۹۷۵ء تک، ص ۵۱۔

۵۲۔ جس میں شامل ہیں:

اتحادِ وقت (unity of time) —یعنی کہانی/واقعہ کا دورانیہ چوبیس گھنٹے پر محیط ہو

اتحادِ عمل (unity of action)—یعنی کہانی کا ایک ہی پلاٹ ہو

اتحادِ مکاں (unity of place)—یعنی کہانی/واقعہ ایک ہی جگہ سے متعلق ہو۔

۵۳۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں: ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک، ص۸۶۔

۵۴۔ اس کتاب کا مکمل حوالہ حاشیہ ۴۵ میں آ چکا ہے۔

۵۵۔ گائتری چکرورتی سپیوک (Gayatri Chakravorty Spivak)، "The Politics of Translation" مشمولہ *The Translation Studies Reader* مرتب لارنس وینوتی (Lawrence Venuti) (لندن اور نیویارک: رٹلج، ۲۰۰۰ء)، ص۳۹۷–۴۱۶۔

۵۶۔ جے اے نوڈے (J. A. Naudé)، "An Overview of Recent Developments in Translation Studies With Special Reference to the Implications for Bible Translation" مشمولہ *Acta Theologica Supplementum* ۲، (۲۰۰۲ء)؛ ص۵۳۔

۵۷۔ محمد ہارون قادر "فورٹ ولیم کالج: تاریخ کے آئینے میں" مشمولہ تخلیقی ادب، ۸ (جون ۲۰۱۱ء)؛ ص۱۳۹۔

۵۸۔ عابدہ سمیع الدین (مرتب)، *Encyclopaedic Dictionary of Urdu Literature*، جلد ۲ (نیو دہلی: گلوبل ویژن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء)، ص۱۶۲۔

۵۹۔ تھامس گراہم بیلے (Thomas Grahame Bailey)، *A History of Urdu literature* (کلکتہ: ایسوسی ایشن پریس، ۱۹۳۸ء)، ص۱۳۲۔

۶۰۔ اولگا کاسترو (Olga Castro)، "Introduction: Gender, Language and Translation at the Crossroads of Disciplines" مشمولہ *Gender and Language*، ۷ (۲۰۱۳ء)؛ ص۷۔

۶۱۔ ایضاً، ص۷۔

۶۲۔ وینوتی کے خیالات کی نمائندہ کتابوں میں درج ذیل دو زیادہ اہم ہیں:

The Translator's Invisibility: A History of Translation؛ *The Scandals of Translation: Towards an Ethics of Difference* (لندن اور نیو یارک: رٹلج، ۱۹۹۸ء)۔

مآخذ

باؤر، لوری (Laurie Bauer)۔ *The Linguistics Student's Handbook*۔ ایڈنبرا: ایڈنبرا یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء۔

بیسنٹ، سوزن (Susan Bassnett)۔ *Translation Studies*۔ لندن اور نیو یارک: رٹلج، ۱۹۸۰ء۔

_________________ اور لیفیور، آندرے (André Lefevere) (مرتبین)۔ *Translation, History and Culture*۔ لندن اور نیو یارک: پنٹر، ۱۹۹۰ء۔

بیکر، مونا (Mona Baker)۔ "Corpus Linguistics and Translation Studies: Implications and

"Applications" ۔مشمولہ Text and Technology: In Honour of John Sinclair ۔مرتب بیکر،مونا (Mona Baker)، فرانسس، گِل (Gill Francis) اور ٹوگنینی-بونیلی (Tognini-Bonelli) ۔ ایمسٹرڈیم اور فلیڈلفیا: جان بنجمز، ۱۹۹۳ء: ص ۲۳۳–۲۵۰۔

ٹوری، گڈیئن (Gideon Toury)۔ Descriptive Translation Studies and Beyond ۔ایمسٹرڈیم اور فلیڈلفیا: جان بنجمز، ۱۹۹۵ء۔

حاتم، بیسل (Basil Hatim) اور منڈے، جیریمی (Jeremy Munday)۔ Translation: An Advanced Resourcebook ۔لندن: رُوٹلیج، ۲۰۰۴ء۔

حسن، خالد (مترجم)۔ Bitter Fruit: The Very Best of Saadat Hasan Manto ۔نیو دہلی: پینگوئن، ۲۰۰۸ء۔

رائس، کیتھرینا (Katherina Reiss)۔ Translation Criticism: Potential and Limitations ۔مترجم رہوڈز، ای ایف (E. F. Rhodes)۔ مانچسٹر: سینٹ جیروم، ۲۰۰۰ء۔

_______________ اور ورمیئر، ہانس جے (Hans J. Vermeer)۔ Towards a General Theory of Translational Action: Skopos Theory Explained ۔مترجم نارڈ، کرسٹیانا (Christiane Nord)۔ لندن اور نیو یارک: رُوٹلیج، ۲۰۱۴ء۔

سپیوک، گائتری چکرورتی (Gayatri Chakravorty Spivak)۔ "The Politics of Translation" ۔مشمولہ The Translation Studies Reader ۔مرتب وینوتی، لارنس (Lawrence Venuti)۔ لندن اور نیو یارک: رُوٹلیج، ۲۰۰۰ء، ص ۳۹۷–۴۱۶۔

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا سے اردو سے ۱۹۷۵ء تک۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء۔

سمیع الدین، عابدہ (مرتب)۔ Encyclopaedic Dictionary of Urdu literature ۔جلد ۱۔ نیو دہلی: گلوبل ویژن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء۔

شٹل ورتھ، مارک (Mark Shuttleworth)۔ "Polysystem Theory" ۔مشمولہ Routledge Encyclopedia of Translation Studies ۔مرتب بیکر، مونا (Mona Baker)۔ لندن اور نیو یارک: رُوٹلیج، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۶–۱۷۹۔

شوپنگ، رین (Ren Shuping)۔ "Translation as Rewriting" ۔مشمولہ International Journal of Humanities and Social Science، ۳ (اکتوبر ۲۰۱۳ء): ص ۵۵–۵۹۔

قادری، محمد ہارون۔ "فورٹ ولیم کالج: تاریخ کے آئینے میں" ۔مشمولہ تخلیقی ادب، ۸ (جون ۲۰۱۱ء): ص ۱۲۶–۱۵۱۔

کاسترو، اولگا (Olga Castro)۔ "Introduction: Gender, Language and Translation at the Crossroads of Disciplines" ۔مشمولہ Gender and Language، ۷ (۲۰۱۳ء): ص ۵–۱۲۔

کسماؤل، پال (Paul Kussmaul) اور ٹرکونن کونڈٹ، سونجا (Sonja Tirkkonen-Condit)۔ "Think-Aloud Protocol Analysis in Translation Studies" ۔مشمولہ TTR: Traduction, Terminologie, Rédaction، ۸ (۱۹۹۵ء): ص ۱۷۷–۱۹۹۔

کیٹفورڈ، جے سی (J. C. Catford)۔ A Linguistic Theory of Translation: An Essay in Applied

Linguistics۔ اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء۔

گراہم بیلے، تھامس (Thomas Grahame Bailey)۔ *A History of Urdu Literature*۔ کلکتہ: ایسوی ایشن پریس، ۱۹۳۸ء۔

لیفیون آندرے (Andre Lefevere)۔ *Translation, Rewriting and the Manipulation of Literary Fame*۔ اوکسفرڈ اور نیو یارک: پرگیمن، ۱۹۹۲a ء۔

__________________۔ *Translation/History/Culture: A Sourcebook*۔ لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۱۹۹۲b ء۔

محمد، اسد الدین "Manto Flattened: An Assessment of Khalid Hasan's Translations"۔ مشمولہ *Annual of Urdu Studies* جلد ۱۱ (۱۹۹۶ء): ص ۱۲۹–۱۳۹۔

منڈے، جیریمی (Jeremy Munday)۔ *Introducing Translation Studies: Theories and Applications*۔ لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۲۰۰۱ء۔

میلم کیئر، کرسٹن (Kirsten Malmkjær)۔ "Norms and Nature in Translation Studies"۔ مشمولہ *Incorporating Corpora: The Linguist and the Translator*۔ مرتب اینڈرمین، گنیلا (Gunilla Anderman) اور راجرز، مارگریٹ (Margret Rogers)۔ برسل: ملٹی لنگوئل میٹرز، ۲۰۰۸ء ص ۴۹–۵۹۔

نارڈ، کرسٹیانا (Christiane Nord)۔ *Translating as a Purposeful Activity: Functionalist Approaches Explained*۔ مانچسٹر: سینٹ جیروم، ۱۹۹۷ء۔

__________________۔ *Text Analysis in Translation: Theory, Methodology and Didactic Application of a Model for Translation-Oriented Text Analysis*۔ ایمسٹرڈیم اور نیویارک: روڈوپی، ۲۰۰۵ء۔

نوڈے، جے اے (J. A. Naudé)۔ "An Overview of Recent Developments in Translation Studies With Special Reference to the Implications for Bible Translation"۔ مشمولہ *Acta Theologica Supplementum*، ۲ (۲۰۰۲ء): ص ۴۴–۶۹۔

نورین، فاخرہ۔ ترجمہ کاری۔ اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۴ء۔

نیڈا، یوجین (Eugene Nida)۔ *Toward a Science of Translating*۔ لیڈن: ای جے برل، ۱۹۶۴ء۔

__________________ اور ٹیبر، سی آر (C. R. Taber)۔ *The Theory and Practice of Translation*۔ لیڈن: ای جے برل، ۱۹۶۹ء۔

نیو مارک، پیٹر (Peter Newmark)۔ *Approaches to Translation*۔ اوکسفرڈ اور نیو یارک: پرگیمن، ۱۹۸۱ء۔

__________________۔ *A Textbook of Translation*۔ نیو یارک اور لندن: پرینٹس ہال، ۱۹۸۸ء۔

وڈیا سٹوتی، سوسانا (Susana Widyastuti)۔ "Componential Analysis of Meaning: Theory and Application"۔ مشمولہ *Journal of English and Education* شمارہ ۴ (۲۰۱۰ء): ص ۱۱۶–۱۲۸۔

ورمیئر، ہانس جے (Hans J. Vermeer)۔ "Skopos and Commission in Translational Action"۔ مشمولہ The Translation Studies Reader۔ مرتب وینوتی، لارنس (Lawrence Venuti)۔ لندن اور نیو یارک رٹلیج، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۱-۲۳۲۔

ونے، ژاں پال (Jean-Paul Vinay) اور ڈاربلنے، ژاں (Jean Darbelnet)۔ *Comparative Stylistics of French and English: A Methodology for Translation*۔ مترجم اور مرتب سیگر، جوآن سی (Juan C. Sager) اور ہیمل، ایم جے (M. J. Hamel)۔ ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ، ۱۹۹۵ء۔

وینوتی، لارنس (Lawrence Venuti)۔ *The Translator's Invisibility: A History of Translation*۔ لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۱۹۹۵ء۔

________۔ *The Scandals of Translation: Towards an Ethics of Difference*۔ لندن اور نیو یارک: رٹلیج، ۱۹۹۸ء۔

ہولز مینٹیری، جسٹا (Justa Holz-Mänttäri)۔ *Translatorisches Handeln: Theorie und Methode*۔ ہیلسنکی: Suomalainen tiedeakatemia، ۱۹۸۴ء۔

ہیکانن، رائلا (Raila Hekkanen)۔ "Direct Translation – Is it the only Option? Indirect Translation of Finnish Prose Literature into English"۔ مشمولہ *True North: Literary Translation in the Nordic Countries*۔ مرتب بی جے ایپسٹین (B. J. Epstein)۔ نیو کاسل اپان ٹائن: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۴ء، ص ۴۷-۶۴۔